جلد (۲) عدد (۵) ۶ ۸ ۷ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۲ ہجری

ترجمان القرآن

مجلس تحریک قرآن کا ماہوار رسالہ

مُرتبہٗ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ صمہ   بیرون ہند کے لیے (ستے)   قیمت فی پرچہ ۸ر

خالی صفحه

فہرست مضامین

اِشارات

ہر ذاتِ متصف کے لئے اپنے اتصاف کی حیثیت سے دو کمال ہوا کرتے ہیں۔ ایک کمال تو یہ ہے کہ وہ جس صفت سے متصف ہے اس میں اتصاف کی انتہا کو پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کی ذات میں وہ صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسری ذوات تک متعدی ہو اور دوسروں کو بھی اسی صفت کے رنگ میں رنگ دے۔ برف کا کمال اول یہ ہے کہ وہ خود انتہا درجہ کی سرد ہے۔ اور کمال ثانی یہ کہ وہ دوسری چیزوں کو بھی سرد کر دیتی ہے۔ آگ کا کمال اول یہ ہے کہ وہ خود انتہا درجہ کی گرم ہے۔ اور کمال ثانی یہ کہ وہ آس پاس کی چیزوں کو بھی اپنی اسی کیفیت سے متکیف کر دیتی ہے۔ بالکل یہی حال نیکی اور بدی کا بھی ہے۔ نیک آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود نیکی کا مجسمہ بن جائے۔ اور دوسرا کمال یہ کہ وہ اپنے اثر سے دوسروں کو بھی نیک بنا دے۔ اسی طرح بُرے آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود بدی کی صفت سے بدرجۂ اتم متصف ہو۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی اس بدی کو دوسروں تک متعدّی کر دے۔

اس قاعدہ کلیہ کے مطابق کافر و مومن کے لئے بھی کمال کے دو مرتبے ہیں۔ کافر اگر بجائے خود اپنے عقیدۂ کفر میں راسخ اور مضبوط ہو تو وہ کمال کفر کے پہلے مرتبے میں ہے۔ اور اگر وہ کفر کی تبلیغ کرے، لوگوں کو راہ حق سے روک کر باطل کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کرے، اور اپنے زورِ بیان، یا زورِ مال یا زورِ شمشیر یا کسی دوسرے زور سے کفر کی اشاعت کرے، تو وہ کمالِ کفر کے دوسرے مرتبہ کی بھی تحصیل کر لیتا ہے، اور ان دونوں مرتبوں کو

جمع کرنے کے بعد اس کے لئے کمال کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح مومن اگر خود اپنے عقیدۂ ایمان میں راسخ، اور اطاعت حق میں کامل ہو تو وہ کمالِ ایمان کے پہلے مرتبہ پر فائز ہوگا۔ اور اگر اس میں یہ صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسروں میں بھی ایمان اور اطاعتِ حق کی تبلیغ واشاعت کرنے لگے، اور دوسرے بندگان خدا کو بھی اپنی زبان یا اپنے قلم، یا اپنے روپیہ یا اپنے دست و بازو یا اپنے اور وسائل سے ایمان داسلام کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرے، تو اس کو کمال ایمان کا دوسرا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد وہ پورا مومن کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس مضمون کو سورۂ آل عمران کے دسویں اور گیارہویں اور بارہویں رکوع میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا:۔

قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ۔ (اے محمدؐ ان سے) کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو؟

پھر فرمایا:۔

قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَھَا عِوَجًا۔ کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے روکتے اور اس راہ کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو؟

یہ دونوں آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ کفر کا پہلا کمال، آیات الٰہی کا خود منکر ہونا ہے اور دوسرا کمال اس کفر کی اشاعت کرنا، اور لوگوں کو خدا کے سیدھے رستے سے روکنا، اور اعتقاد و عمل کے ٹیڑھے راستے ان کے سامنے پیش کرنا ہے۔

اس کے بعد مومنوں سے خطاب شروع ہوتا ہے، اور ان سے بھی دو باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

کا حق ہے، اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب کے سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ۔

دوسرے یہ کہ:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہئے جو نیکی کی طرف بلاتی ہو اچھے کام کا حکم دیتی ہو اور برے کام سے روکتی ہو۔ اور فلاح پانے والے ایسے ہی لوگ ہیں

یہاں ایمان کے بھی دو درجے بتائے ہیں۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مومن خود اللہ سے ڈرنے والا ہو، اور مرتے دم تک اوامر الٰہی کا مطیع رہے، اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رکھے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے دوسرے ابنائے نوع کو بھی نیکی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔

پھر کمال ثانی کے اندر بھی بہت سے مراتب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موم بتی، بجلی کا قمقمہ، چاند اور سورج، سب پر منیر اور روشن گر ہونے کا اطلاق ہوتا ہے، مگر روشن گری میں ان کے مدارج متفاوت ہیں۔ موم بتی صرف ایک حجرے کو روشن کر سکتی ہے، بجلی کے قمقمے کی روشنی ایک بڑے مکان کی حد تک پھیل سکتی ہے، چاند کی روشنی زمین اور اس کے ارد گرد کی فضا تک محدود ہے۔ مگر سورج تمام عالم کو اپنی روشنی سے چمکا رہا ہے اور ہمارا پورا نظام شمسی اس کی روشنیوں سے منور ہے۔ اسی طرح مومن اپنے جیسے ایک انسان کے دل میں بھی ایمان کی شمع روشن کر دے تو وہ کمال ثانی کے مرتبہ میں داخل ہو جائیگا لیکن یہ اس کمال کا پہلا درجہ ہوگا پھر ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک میں دعوت الی الخیر کے مدارج ہیں۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت الی الخیر تمام عالم انسانی کے لئے عام ہو۔ وہ ساری دنیا کو نیکی کی طرف بلائے۔

پورے ربع مسکوں میں اللہ کا فوجدار بن جائے، بدی اور منکر جہاں بھی ہو اس کے استیصال کے لئے آستین چڑھائے۔ اور اپنے آپ کو کسی خاص برادری کسی خاص قوم، کسی خاص ملک، اور کسی خاص نسلی یا جغرافی حد کے اندر محدود نہ سمجھے۔ یہ کمال ایمان کا سب سے بڑا اور سب سے اونچا درجہ ہے۔ اور چونکہ حضرت حق جل مجدہ نے ہر معاملے میں مسلمانوں کے سامنے ایک بلند مطمح نظر پیش فرمایا ہے۔ اور کسی جگہ پست حوصلگی کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اس لئے آگے چل کر بارہویں رکوع میں، ان کو بتایا ہے کہ تم کمال ایمان کے اسی آخری درجہ تک پہنچنے کے لئے ہو:۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۳: ۱۲)۔

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

آیت۔ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ ..... الخ کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ اور اس اختلاف کا منشا لفظ مِنكُم ہے ایک گروہ کہتا ہے کہ مِن یہاں تبعیض کے لئے نہیں بلکہ تبیین کے لئے آیا ہے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں وہ تبعیض ہی کے لئے آیا ہے۔

پہلے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا ہے جیسا کہ فرمایا كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ... الخ اور حقیقت میں ہر مکلف ہستی پر واجب ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور بدی کو دفع کرے، خواہ ہاتھ سے کرے یا زبان سے کرے یا اور کچھ نہ ہو سکے تو قلب ہی سے کرے۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ "تم ایسی امت ہو جاؤ جو خیر کی طرف بلاتی، اور برائی سے روکتی ہو"۔ کیونکہ من یہاں تبیین کے لئے ہے۔ اور اس کی مثال یہ آیت ہے کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (یعنی بتوں کی گندگی سے بچو نہ یہ کہ بتوں میں سے اس چیز سے بچو جو گندگی ہے)۔

دوسرا اگر وہ کہتا ہے کہ مِن یہاں تبعیض کے لئے آیا ہے، اور اس کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں میں ایک بڑا حصّہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مریضوں پر مشتمل ہے جو دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے واجبات ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے کچھ شرائط ہیں جو ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کے لئے خیر اور معروف اور منکر کا صحیح علم درکار ہے۔ اس کے لئے حکمت اور عقل کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ آدمی پہلے خود کمال درجہ کا متقی اور پرہیزگار ہو، تب لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دے۔ (دیکھو مفاتیح الغیب للامام الرازی، وغرایب القرآن للنیسابوری، انوار التنزیل للبیضاوی)۔

مگر کتاب اللہ اور سنت رسولؐ میں تامل کرنے سے یہ اختلاف بآسانی دور ہو سکتا ہے۔

ہم نے اوپر کلام اللہ سے مومن کے لئے دو کمال ثابت کئے ہیں۔ ان میں سے پہلا کمال یعنے خوف خدا اور اوامر الٰہیہ کے آگے سر جھکا دینا، اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہنا، تو ذات مومن کے ساتھ صفت ایمان کے نفس قیام کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا ہر مومن میں اس کمال کے کسی نہ کسی مرتبہ کا متحقق ہونا لابد ہے کہ اگر وہ اس میں متحقق نہ ہو تو وہ مومن ہی نہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اگر چراغ میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغ ہی نہ ہوگا۔ اگر برف میں سردی نہ ہو تو وہ برف ہی نہ ہوگی۔ اگر آگ میں گرمی نہ ہو تو وہ آگ ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کو خطاب کر کے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ اور وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ اس آیت میں تبعیض کا نام و نشان تک نہیں ہے بلکہ عموم کے ساتھ تاکید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان میں لازمی طور پر یہ صفات ہونی چاہییں۔

رہا دوسرا کمال تو وہ کمال زاید ہے جس کا متحقق ہونا، مومن کے مومن ہونے کے لئے نہیں، بلکہ اس کے کمال و تکمل اور بلند مرتبہ و عالیشان مومن ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اب اس کمال کے اعتبار سے ایک قوم کی دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حالت تو یہ ہے کہ پوری قوم کی قوم اس صفت کی حامل اور اس مرتبہ کمال پر فائز ہو۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ قوم کے کم از کم ایک حصہ میں کمال ایمان کا یہ اعلیٰ مرتبہ متحقق ہو۔ اور باقی افراد صرف کمال اول سے متصف رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم پہلی حالت میں ہو یعنی اگر تمہاری پوری قوم دنیا میں آفتاب ہدایت بن جائے، اور تمام اقوام عالم کو نیکی کا حکم دینے والی اور بدی سے روکنے والی ہو تو تم دنیا کی بہترین امت ہو گے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ لیکن اگر تم میں اس اعلیٰ مرتبہ کی ہمت نہ ہو اور پوری قوم اس صفت سے متصف نہ ہو سکے، تو تمہارے اندر کم از کم ایک گروہ تو ایسا رہنا ہی چاہیے جو خیر کی طرف بلاتا رہے۔ اور بدی سے روکتا ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ الخ اسی لئے پہلی آیت میں عموم ہے مگر تاکید نہیں۔ اور دوسری آیت میں تاکید ہے مگر عموم نہیں:

کمال ایمان کے یہ دو درجے، جن کا بار بار ذکر آ رہا ہے۔ صرف اعتبار میں دو ہیں ورنہ حقیقت میں تو دونوں ایک ہی ہیں جس شخص کے دل میں ایمان راسخ موجود ہو گا، اور جو اللہ سے ایسا ڈرنے والا ہو گا جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے، اس کے لئے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کو گمراہی میں مبتلا دیکھے اور اسے راہ حق کی طرف دعوت نہ دے کہیں بدی کا وجود پائے اور اس کو مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ طبیعت مومن کی مثال ایسی ہے جیسے مشک کہ رائحہ ایمان اس کے جرم تک محدود نہیں رہتی بلکہ پھیلتی ہے۔ جہاں تک پھیلنے کا اس کو موقع ملے۔ یا چراغ کہ نور ایمان سے جہاں وہ منور ہوا، اور اس نے آس پاس کی فضا میں اپنی شعاعیں پھیلا دیں مشک میں جب تک خوشبو رہے گی۔ وہ مشام جان کو معطر کرتا رہے گا۔ چراغ جب تک روشن رہے گا۔ روشن کرتا رہے گا

مگر جب مشک کی خوشبو قریب سے قریب سونگھنے والے کو بھی محسوس نہ ہو، اور چراغ کی روشنی اپنے قریب ترین ماحول کو بھی روشن نہ کرے تو ہر شخص یہی حکم لگائے گا کہ مشک مشک نہیں رہا۔ اور چراغ اپنی چراغیت کھو چکا ہے یہی حال مومن کا ہے، کہ اگر وہ خیر کی طرف دعوت نہ دے نیکی کا حکم نہ دے، بدی کو برداشت کرے اور اس سے روکے نہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں خوف خدا کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور ایمان کی روشنی مدھم ہو گئی ہے۔

اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "کہ تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اور اگر استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان ہی سے سہی، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل میں اس کو برا سمجھے اور اس کے مٹانے کی خواہش رکھے، کیونکہ یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے"۔ اور اسی لئے قرآن مجید میں مومنوں کی عام صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹ : ۹)۔

مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ اور بدی سے روکتے ہیں

التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ

وہ توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے خدا کی حمد کرنے والے، خدا کی راہ میں سفر کرنے والے، رکوع وسجود کرنے والے نیکی کا حکم دینے والے بدی سے روکنے والے اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

(۹ : ۱۱۲)

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲: ۶)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے ان کو زمین میں طاقت بخش دی تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے، اور بدی سے روکیں گے۔

پھر جب کہ مومن کی ضروری صفات میں سے ایک صفت امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کی حیثیت فرض کفایہ کی سی رکھی گئی، اور اس معاملہ میں اتنی نرمی کی گئی کہ مسلمانوں کی پوری قوم میں سے صرف ایک جماعت کا آمر بالمعروف اور ناھی عن المنکر ہونا کافی سمجھا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا علیم وخبیر کو معلوم تھا کہ عہد رسالت کے گذر جانے کے بعد مسلمانوں کے ایمان ضعیف تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جائیگا یہ قوم مائل تنزل ہوتی جائے گی حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہوں گے مگر ان کی شمع ایمان میں اتنی روشنی بھی نہ ہوگی کہ اپنے قریبی ماحول ہی کو منور کر سکیں، بلکہ ظلمت کفر کے غلبہ سے خود ان کے اپنے نور کے بجھ جانے کا خوف ہوگا۔ لہذا ایسی حالتوں کے لئے اس نے فرمایا کہ تمہارے اندر کم از کم ایک ایسی جماعت تو ضرور ہی موجود رہنی چاہئے جو خیر کی طرف دعوت دینے والی، اور بدی کا مقابلہ کرنے والی ہو۔ کیونکہ اگر تمہارے اندر ایسی ایک جماعت بھی نہ رہے تو پھر تم کو عذاب الٰہی، اور قطعی ہلاکت وتباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس مضمون کو قرآن مجید میں خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ	بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا تھا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لئے کہ انہوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گذر جاتے تھے۔

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۵: ۱۱)

ایک دوسرے کو ان بری باتوں سے نہ روکتے تھے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور یہ بہت بری بات تھی جو وہ کرتے تھے

دوسری جگہ فرمایا :۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱: ۱۰)

تم سے پہلے کی قوموں میں کچھ لوگ ایسے کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔ ان میں ایسے لوگ اگر تھے بھی تو وہ بہت کم تھے سو ان کو ہم نے نجات دیدی۔ باقی رہے ظالم لوگ تو وہ مجرم تھے تو اے نبی تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو یونہی ظلم سے ہلاک کر دے، درانحالیکہ ان کے باشندے نیکوکار ہوں

اس مضمون کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان فرمایا ہے کہ :۔

ان الله لا یعذب العامة بعمل خاصة حتی یروا المنکر بین ظهرانیهم وهم قادرون علی ان ینکروه فلا ینکروه فاذا فعلوا ذلك عذب الله الخاصة والعامة (رواہ احمد)

اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے برے اعمال کی سزا نہیں دیتا جبتک کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچ جائے کہ وہ اپنے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں، اور ان کو روکنے کی قدرت رکھتے ہوں اور پھر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو اللہ خاص اور عام سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا :۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم

ولتنہن عن المنکر ولتاخذن علی ید المسیئی ولتطرنہ علی الحق اطراً او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض او لیلعنکم کما لعنہم۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجہ باختلاف قلیل)۔

لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی برائیاں ایک دوسرے پر مسلط کر دیگا۔ یا تم پر اس طرح لعنت کرے گا۔ جس طرح کعار بنی اسرائیل پر کی۔

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت و لتکن منکم امۃٌ ... الخ میں جو تبعیض ہے، وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ مسلمانوں میں سے صرف ایک ہی ایسی جماعت مطلوب ہے جو داعی الی الخیر اور آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہو۔ اور باقی مسلمانوں کے لئے اس خدمت کا بجا لانا واجب نہیں ہے بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور ہی رہنی چاہئے جو خیر کی شمع روشن رکھے اور شر کی ظلمت کو دفع کرتی رہے اگر ایسی ایک جماعت بھی ان میں موجود نہ رہی تو خیر امت ہونا تو درکنار اس قوم کا عذاب آلہی اور لعنت خداوندی سے بچ جانا بھی محال ہے۔

افسوس ہے کہ اس مرتبہ جگہ کی قلت کے باعث شیخ عبد العزیز شادیش کے خطبات کا سلسلہ رک گیا شاید آئندہ اشاعت میں اس کے لئے جگہ نکالی جا سکے۔

اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی

(۵)
زندگی کا نصب العین

گذشتہ صحبت میں جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اسلام نے ہر قسم کی دنیوی اور اخروی اغراض کو چھوڑ کر ایک چیز کو زندگی کا نصب العین اور انسان کی تمام کوششوں کا مقصود، اور تمام ارادوں اور نیتوں کی غایت الغایات قرار دیا ہے، اور وہ چیز اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کا حصول ہے۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ اس نصب العین میں وہ کونسی خصوصیات ہیں جو اس کو ایک بہترین نصب العین بناتی ہیں۔

طبیعی اور عقلی نصب العین کی ہم آہنگی کائنات کے متعلق اسلام کا نظریہ، جو نظریہ کی حد سے گذر کر ایمان اور یقین کی آخری حد تک پہنچ گیا ہے، یہ ہے کہ وجود کی اس غیر محدود سلطنت کا فرمانروا ایک خدا ہے، اور تمام موجودات عالم اسی کے مطیع، اسی کے تابع فرمان، اور اسی کے آگے سربسجود ہیں۔ وَلَهُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُوْنَ۔ (۳۰: ۳) کارگاہِ ہستی کی تمام حرکات و سکنات اسی کے حکم اور اسی کی مرضی کے ماتحت ہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶: ۷) جتنی چیزیں اس عالم اور دوسرے تمام عوالم میں ہیں ان سب کا مرجع اسی کی ذات ہے۔ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۲: ۲۵) اسی چیز کا نام اسلام ہے جس کے معنی ہیں

گردن جھکا دینے اور تابع فرمان ہو جانے کے تمام کائنات اور اس کا ہر ذرہ اپنی فطرت کے لحاظ سے اسی دین اسلام کا پیرو ہے، خواہ بطوع و رغبت، خواہ بقہر و جبر۔ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (۳ : ۹) اس عالمگیر ناقابل تغیر اور ناآشنائے استثنا قانون میں تمام کائنات کی طرح خود انسان بھی جکڑا ہوا ہے، اور اس کی اپنی طبیعت و فطرت بھی اسی خدا کی مطیع و فرمانبردار، اسی کے دین کی پیرو ہے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۳۰ : ۴)۔

اس نظریہ کے مطابق تمام موجوداتِ عالم کا (جن میں انسان بھی شامل ہے) فطری نصب العین اور مقصود و مطلوب اور غایت الغایات، حضرت حق جل ثناءُہٗ کی ذات ہے، اور سب کی طبیعت کا رخ اسی مرکز و مرجع کی طرف پھرا ہوا ہے۔ اب انسان کے لئے بحیثیت ایک عقلی وجود کے صرف اتنی کسر رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس طبیعی نصب العین کا شعور بھی حاصل کرے، اور عقل و فکر کے ساتھ اس کو سمجھ کر اپنے ارادوں اپنی نیتوں اور اپنی سعی و عمل کا رخ بھی اسی کی طرف پھیر دے اس صورت میں اس کا عقلی نصب العین، اس کے اور تمام موجودات کے طبیعی نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیگا جہان ہستی کے سارے لشکر، اور نظامِ وجود کے سب کل پرزے اس مقصود تک پہنچنے میں اس کا ساتھ دیں گے، اور وہ اپنے عقلی مرتبہ کے لحاظ سے اس عظیم الشان قافلے کا سالار اور امام ہوگا۔ برعکس اس کے اگر اس نصب العین کو چھوڑ کر اس نے کسی اور چیز کو اپنا عقلی نصب العین بنایا، تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص ایک قافلے کے ساتھ ہے قافلہ مغرب کی جانب سفر کر رہا ہے، وہ شخص خود جس گھوڑے پر سوار ہے وہ بھی مغرب کی جانب دوڑ رہا ہے لیکن اس بے ہوش مسافر کو خبر نہیں کہ قافلہ کا رخ، اور اس کی اپنی سواری کا رخ کدھر ہے۔ اس کا دل مشرق میں اٹکا ہوا ہے اس نے اپنے گھوڑے کی دم کی طرف اپنا منہ کر رکھا ہے لگام کھینچ کھینچ کر اور ایڑیں لگا لگا کر کوشش کر رہا ہے کہ گھوڑا الٹے پاؤں چلے۔ چند قدم وہ گھوڑے

کو پیچھے کی طرف کھینچ بھی لاتا ہے۔ مگر پھر قافلے کی روش اور خود اپنی طبعی روش سے مجبور ہو کر گھوڑا اسی مغربی سمت میں دوڑنے لگتا ہے۔ غرض اس طرح یہ مسافر کشاں کشاں اپنی نیت اور اپنے ارادے کے خلاف اسی منزل کی طرف جانے پر مجبور ہوتا ہے مگر ایک کامیاب اور بامراد مسافر کی طرح نہیں بلکہ ایک ناکام و نامراد مسافر کی طرح کیونکہ اس نے جس چیز کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے اس تک پہونچنا اسے نصیب نہیں ہوتا اور وہ ان فوائد سے بھی متمتع نہیں ہوتا جو اس قافلے کو اپنے سفر کے دوران میں حاصل ہوتے ہیں۔

۲۔ نظام اسلامی کی قوت جاذبہ

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، دین اسلام کے پورے نظام کا مرکز اور مدار خدا کی ذات ہے۔ یہ پورا نظام اسی مرکز کے گرد گردش کر رہا ہے اور اس نظام میں جو کچھ بھی ہے خواہ وہ نیت و اعتقاد کے قبیل سے ہو، یا پرستش و عبادت کے قبیل سے، یا دنیوی زندگی کے معاملات میں سے، بہر نوع اور بہر کیف اس کا رخ اسی مرکزی ہستی کی جانب پھرا ہوا ہے، اور ہر چیز اس کی قوت جاذبہ کے زبردست تاروں میں جکڑی ہوی ہے۔ خود لفظ دین (طاعت) اور لفظ اسلام (گردن نہادن)، جن سے اس مذہبی نظام کو موسوم کیا گیا ہے، اپنے مسمّیٰ کی فطرت و حقیقت پر بہترین دلالت کرتے ہیں، دین اور اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ بندہ اپنے خدا کی رضا کے آگے سر جھکا دے، اور اسی کی مرضی کا تابع ہو جائے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (۴ : ۱۸)	اس سے بہتر دین اور کس کا ہوگا جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور جو نیکوکار رہے؟
وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (۳۱ : ۳)	جو کوئی اپنا رخ خدا کی طرف پھیر دے اور اس کے ساتھ وہ نیکوکار بھی ہو تو اس نے بڑی مضبوط رسّی تھام لی۔

اس سے بھی بڑھ کر فطرت اسلام کا اندازہ اس چیز سے ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم اور ان کے صاحبزادے خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، بیٹا۔ یَٰٓأَبَتِ ٱفۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ کہ کر اپنے آپ کو چھری کے حوالے کر دیتا ہے اور باپ اپنے لخت جگر کو محض خدا کی خوشنودی کے لئے ذبح کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تو ان دونوں کے اس فعل کو "اسلام" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فَلَمَّآ أَسۡلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلۡجَبِينِ (۳۷ : ۳)

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو کچھ بھی ہے خدا کے لئے ہے۔ نماز اگر خدا کے لئے نہ ہو تو وہ ایک بے معنی اٹھک بیٹھک ہے۔ روزہ اگر خدا کے لئے نہ ہو تو وہ محض ایک فاقہ ہے۔ زکوٰۃ و خیرات اگر خدا کے لئے ہو تو خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ ہے ورنہ محض اسراف و تبذیر .... جنگ اور جہاد اگر خالصۃً للہ اور فی سبیل اللہ ہو تو بہترین عبادت ہے ورنہ ایک ناحق کی خونریزی، اور جہاد فی سبیل الطاغوت۔ اسی طرح دوسرے تمام افعال جن کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے اگر خدا کے لئے کئے جائیں تو وہ نیک اور قابل اجر ہیں، ورنہ بے فائدہ اور بے نتیجہ اور جن سے اسلام نے منع کیا ہے، اگر ان سے اجتناب خدا کی خوشنودی کی خاطر کیا جائے تو مفید ہے ورنہ قطعاً لاحاصل

یہ زبردست مرکزیت اور یکسوئی جو اسلام کے نظام میں نظر آتی ہے اسی نصب العین کی پیدا کردہ ہے یہی قوت جاذبہ ہے جس نے نظام اسلامی کے تمام اجزاء میں ایک طاقتور مائل المرکز میلان پیدا کر دیا ہے اور جس کی بدولت یہ نظام ویسا ہی ایک مکمل اور مضبوط نظام بن گیا ہے جیسا موجودہ زمانے کے علم ہیئت کی رو سے ہمارا نظام شمسی مکمل اور مضبوط ہے اگر یہ نصب العین نہ ہوتا تو دین اسلام میں یہ نظم بھی نہ ہوتا

۳۔ فکر و عمل کی یکسوئی

جس طرح اس نصب العین نے اسلام کے نظام دینی میں مرکزیت، یکسوئی اور ضبط و نظم کی قوت پیدا کی ہے۔ اسی طرح یہ انسان کے افکار و خیالات ارادات و نیات، اور عقاید و اعمال میں بھی کامل یکسوئی پیدا کر دیتا ہے، اور یکسوئی کے ساتھ اس کو ایک ایسے بلند مطمح نظر اور ...

ایسے اعلیٰ وارفع مقصد کی طرف ہمہ تن متوجہ کر دیتا ہے جس سے زیادہ بلند اور عالی شان اور رفیع المنزلت کوئی مقصد اور مطمح نظر نہیں ہو سکتا جس شخص کے پیش نظر محض اپنی طبیعی خواہشات کی تسکین، یا نفسانی اغراض کی تحصیل، یا روحانی مقاصد کی تکمیل ہو، اسے کبھی فکر و عمل کی یکسوئی میسر نہیں آسکتی۔ کیونکہ عقلی و ذہنی ارتقا اور فطری و علمی اکتشاف کے ہر مرحلے میں اس کے اندر نئی خواہشیں اور نئی رغبتیں پیدا ہوں گی اور وہ نئی نئی چیزوں کو اپنی غایت اور اپنا مقصد قرار دیگا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ علم اور عقل کے کسی اونچے مرحلے پر پہنچ کر انسان انہی طبیعی رغبات اور نفسانی و روحانی طلبات پر جما رہے جو اس سے پہلے کے پست تر مرحلے میں اس کے لئے جاذب نظر اور محرک عمل تھے، اس طرح انسان کی تمام زندگی ایک مقصد سے دوسرے مقصد کی طرف انتقال میں بسر ہو جائے گی۔ اور کبھی کوئی ایسا مرکزی تخیل اس کے ذہن میں جاگزیں نہ ہو سکے گا۔ جو اس کے افکار میں کامل یکسوئی پیدا کر دینے والا ہو، اور جس کی راہ میں وہ اپنی تمام فکری اور عملی قوتیں صرف کر سکتا ہو۔ یہ خوبی صرف اسلامی نصب العین ہی میں ہے کہ وہ ہر مرتبۂ علمی و عقلی میں انسان کا واحد نصب العین بن سکتا ہے، اور کسی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر بھی پہنچ کر اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آتی، کیونکہ ہم جتنے عقلی اور علمی مراتب کا تصور کر سکتے ہیں 'خدا کی ذات' ان سب سے اعلیٰ وارفع ہے اور اس کے باوجود ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبہ سے لے کر بلند سے بلند مرتبے تک ہر ایک کے ساتھ اس کا تعلق یکساں ہے اگر فرق ہے تو وہ محض ہمارے تعقل و شعور کے مراتب کے لحاظ سے ہے۔

۴- خالص بشری اجتماعیت کی شیرازہ بندی

پھر جس طرح یہ نصب العین ایک فرد کا نصب العین بن سکتا ہے، اُسی طرح ایک جماعت، ایک قوم، بلکہ تمام نوع بشری کا نصب العین بھی بن سکتا ہے اس میں سرے سے نفسانیت اور انفرادی یا اجتماعی خود غرضی کا وہ عنصر ہی موجود نہیں ہے جس کی لازمی خاصیت یہ ہے کہ انسانیت کو نسلوں اور قوموں میں اور پھر افراد و اشخاص میں تقسیم کر دے اور ان کے

اندر ایک دوسرے کے خلاف مقابلہ و مزاحمت اور بغض وحسد کے جذبات ابھارتا ہے۔ برعکس اس کے نصب العین انسان کو اُس ہستی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے جس کے ساتھ تمام نوع بشری، بلکہ تمام کائنات کا تعلق یکساں ہے اور جس کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد ہر جہت اور ہر حیثیت سے انسانی مقاصد میں ایسا اشتراک و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگوں میں مقابلہ و مزاحمت تو درکنار، تعاون اور موالات، اخوت اور بھائی چارے کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا کے جتنے مادی مقاصد ہیں ان کی راہ میں دو آدمی بھی ایک دوسرے کے سچے مددگار نہیں ہو سکتے، بھائی اور بھائی، باپ اور بیٹے، ماں اور بیٹی کے لئے بھی ایک مادی مقصد میں شریک ہو کر تزاحم اور کشمکش حتی کہ عداوت اور دشمنی تک سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم نے خود رحم اور خون کے تعلقات منقطع ہوتے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بھائیوں نے بھائیوں کے گلے کاٹ دیے ہیں۔ ہماری نگاہوں سے ایسے بے شمار مناظر گذرے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں کہ قریب سے قریب عزیزوں نے دنیوی مقاصد کی خاطر ایک دوسرے کی جان، مال عزت اور آبرو کو تباہ و برباد کر دیا۔ یہ سب اس نفسانیت اور خود غرضی کی تاثیرات ہیں جو دنیوی اغراض و مقاصد کے عناصر ترکیبی میں سب سے اہم عنصر ہے لیکن ذات حق وہ غایت الغایات ہے جس کی جانب لاکھوں کروڑوں انسان بیک وقت دوڑ سکتے ہیں بغیر اس کے کہ ان میں کوئی کشمکش، مقابلہ اور مزاحمت ہو، اور کسی ایک شخص کو بھی دوسرے شخص کی ٹھوکر لگے۔ برعکس اس کے یہ سفر ایسا سفر ہے جس کا ہر مسافر دوسرے مسافر کی مخلصانہ مدد کرتا ہے، اپنے آرام پر دوسرے کے آرام کو ترجیح دیتا ہے، اپنی مشقت کو دوسرے کی مشقت کے مقابلہ میں گوارا کر لیتا ہے، اور عیش و آرام کے ساتھ جانے سے بدرجہا بہتر اس کو سمجھتا ہے کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کا بوجھ لادے ہوئے، دوسروں کی خدمت کرتے، ہانپتا کانپتا، تھکا ماندا، عرق عرق، منزل مقصود پر پہنچے، اور اپنے مالک کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ نسل، رنگ، زبان، اور جغرافی حدود کے امتیازات کو مٹا کر ایک عالمگیر

قومیت کی تعمیر، اور ایک بین الاقوامی انسانی جمعیت کی شیرازہ بندی کے لئے جس مرکزی تخیل کی ضرورت ہے وہ اس نصب العین میں بدرجہ اتم موجود ہے اس قسم کی جہانگیر تہذیب کے لئے اس سے بہتر نصب العین اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ایک طرف فرد کی انفرادیت کو بالکل فنا بھی نہیں کرتا۔ اور دوسری طرف انفرادیت کے تمام دافع المرکز میلانات کو مٹا کر اسے ایک خالص بشری اجتماعیت میں پوری طرح ضم کر دیتا ہے۔

۵۔ تمام انسانی مرادوں کا بالتبع حصول اس نصب العین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے انسان کے جتنے مقاصد ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے تحقق کے ساتھ بالتبع حاصل ہوتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ انسان ان کو بالذات مقصود بنائے۔ قرآن مجید نے ایک ایک کر کے ان سب چیزوں کو گنایا ہے جو رضائے الٰہی کے حصول کے ساتھ لازماً حاصل ہوتی ہیں۔

دنیوی زندگی میں انسان سب سے زیادہ جس چیز کا خواہشمند ہوتا ہے وہ امن و سکون، راحت اور اطمینان قلب ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرو۔ اور اس کی خوشنودی کے طالب ہو جاؤ۔ یہ چیز تم کو آپ سے آپ مل جائے گی۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲ : ۱۳)۔

ہاں جس کسی نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ نیکوکار ہوا، تو اس کا اجر اس کے پروردگار کے پاس ہے، ایسے لوگوں کے لئے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳ : ۴)

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

دوسری چیز جو انسان دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے، خوشحالی ہے، یعنی ایسی زندگی جو پریشانی اور پراگندہ خاطری سے خالی ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے اور اس کے غضب سے بچنے، اور اس کی خاطر پرہیزگاری و نیکوکاری اختیار کرنے سے یہ چیز بھی باحسن وجوہ حاصل ہو جاتی ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷: ۱۲)۔

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۱۶: ۱۳)

جس کسی نے نیک عمل کیا اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ہم اس کو ضرور خوشحالی کی زندگی بسر کرائیں گے اور یقیناً ایسے لوگوں کو ہم ان کے عمل سے بہت زیادہ اچھا بدلہ دیں گے۔

تیسری چیز حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و سربلندی ہے جو انسان کی بڑی مطلوب و مرغوب چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم خدا کے ہو جاؤ۔ یہ متاع خود تمہارے قدموں میں آ رہے گی۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ (۵: ۸)۔

جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان لانے والوں کا دوست ہو گیا (وہ اللہ کی پارٹی میں شامل ہو گیا) اور اللہ کی پارٹی ہی غالب ہونے والی ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ۔ (۲۱: ۷)۔

اور ہم زبور میں پند و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے صالح بندے ہوں گے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلافت عطا کرے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور وہ ضرور ان کے

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔ (۲۴ : ۷)

اس دین کو استحکام بخشیگا۔ جس کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے' اور خوف کے بدلے ان کو امن عطا کریگا

اسی طرح اخروی زندگی میں نجات انسان کی مطلوب ہے اور اس کے متعلق بھی قرآن کہتا ہے کہ وہ صرف خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کے حاصل ہونے کا نتیجہ ہے :۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (۸۹)

اے نفس مطمئن اپنے پروردگار کی طرف واپس ہو۔ اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی پھر (خدا کہے گا کہ) تو میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں نے جتنی چیزوں کو مقصود اور غایت قرار دیا ہے' اسلام نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں کی۔ بلکہ اس چیز کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے۔ جس کے حصول سے یہ سب چیزیں خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں۔ دوسرے جن چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں مسلمان کی نگاہ میں وہ اس قابل ہی نہیں کہ وہ ان کی طلب میں اپنے قلب کو ایک لمحہ کے لئے بھی الجھنے دے اس کے پیش نظر تو ایک ایسا نصب العین ہے جو ان سب سے' اور جہان ہستی کی ہر چیز سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ جب اس بلند ترین مقصود کو وہ پہنچ جائے گا تو اس کے تحت جتنی چیزیں ہیں وہ اس کو آپ سے آپ حاصل ہونگی۔ بالکل اسی طرح جس طرح عمارت کی سب سے اونچی منزل پر پہنچ جانے والا اس کی تمام منازل کو اپنے قدموں کے نیچے پاتا ہے۔

۶۔ تقویٰ اور نیکوکاری کے لئے بہترین محرک

ایک اور خصوصیت اس نصب العین کی یہ ہے کہ اسلام نے پرہیزگاری اور نیکوکاری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے' اور اس کے لئے اوامر و نواہی کا جو ضابطہ پیش کیا ہے' اس کے اتباع پر انسان کو آمادہ کرنے کے لئے صرف یہی نصب العین ایک شریف

اور پاکیزہ نصب العین ہو سکتا ہے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ نیکی اس لئے ہونی چاہیئے کہ وہ نیکی ہے۔ اور بدی سے اس لئے اجتناب ہونا چاہیئے کہ وہ بدی ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہے۔ کہ ان کے اس قول کا مفہوم کیا ہے۔ نیکی محض نیکی کی خاطر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کے فوائد و منافع سے قطع نظر کر کے نیکی بجائے خود نیکی ہے اور وہ انسان کی مقصود بن سکتی ہے۔ اور اسی طرح بدی سے محض اس کے بدی ہونے کی بنا پر اجتناب کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ تمام مضرتوں اور نقصانات سے مجرد کر کے بدی اپنی ذات سے بدی ہے، اور اس کی ذات میں کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے لئے قابل اجتناب ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقتاً دنیا میں انسان کے لئے کسی ایسی خالص نیکی کا وجود ہی نہیں ہے جو ذات فاعل کی طرف عائد ہونے والے تمام فوائد و منافع سے مجرد ہو۔ اور نہ کسی ایسی خالص بدی کا وجود ہے جو فاعل کی ذات کو پہنچنے والی جملہ مضرتوں سے خالی ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں نیکی اور بدی کا تخیل ہی فائدے اور نقصان، منفعت اور مضرت کے تجربات سے پیدا ہوا ہے۔ انسان ہر اس فعل کو نیک کہتا ہے جس سے خود اس کو کوئی حقیقی فائدہ حاصل ہو اگرچہ وہ بظاہر اپنے اندر کچھ مضرتیں بھی رکھتا ہو۔ اسی طرح انسان ہر اس فعل کو بد کہتا ہے جس سے خود اس کی ذات کو کوئی حقیقی مضرت پہنچتی ہو، خواہ وہ ظاہر نظر میں اپنے اندر کچھ منفعتیں بھی رکھتا ہو۔ اگر کسی فعل کو فائدے اور نقصان کے جملہ پہلوؤں سے مجرد کر لیا جائے، اور وہ فعل محض ایک حرکت رہ جائے تو ہم اس پر نیک یا بد ہونے کا کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ نیکی کا ملکہ راسخ ہو جانے اور بلند عقلی مراتب پر پہنچ جانے کے بعد یہ ممکن ہے کہ انسان فائدے اور نقصان کے تصور سے خالی الذہن ہو کر نیکی محض نیکی کی خاطر کرنے لگے، اور بدی سے محض اس کے بدی ہونے کی بنا پر مجتنب رہے لیکن اول تو یہ فقط مبدا ارخیر و شر کی طرف سے ذہول ہے نہ کہ اس کی ہدایت کا سلب، دوسرے یہ محض فلسفیوں کے تخیل کی معراج ہے جس تک پہنچنا بڑے بڑے حکما کو بھی نصیب نہیں ہوا ہے پھر بھلا عام انسان مجرد نیکی

کے اختیار اور مجرد بدی سے اجتناب کو اپنا نصب العین کیونکر بنا سکتے ہیں ؟

اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ نیکی اور بدی کے تصور کو فائدے اور نقصان کے تصور سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ نیکی فی نفسہٖ انسان کی مراد نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تہ میں کوئی فائدہ مضمر نہ ہو، اور بدی بذاتِ خود قابلِ اعتراض قرار نہیں پا سکتی تاوقتیکہ اس کے باطن میں کوئی نقصان پوشیدہ نہ ہو۔ اب اگر ہم تقویٰ اور نیکوکاری کو خود غرضی کے ادنیٰ مرتبے سے اٹھا کر بے نفسی اور خلوص کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچانا اور اسے ایک ایسے ضابطۂ اخلاق کی بنیاد قرار دینا چاہیں جو عوام و خواص سب کے لئے ہو تو اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ فائدے اور نقصان کا ایک ایسا معیار قائم کیا جائے جو مادّیت اور نفسانیت سے بالاتر ہو اور جس کی بنیاد پر تمام مادّی اور نفسانی نقصانات سے لبریز ہونے کے باوجود ایک نیک عمل، انسان کی نگاہ میں سراسر فائدوں سے مملو نظر آئے، اور ہر قسم کی منفعتوں سے پر ہونے کے باوجود ایک بدعمل اس کو سرتاپا نقصان محسوس ہو۔ یہی طریقہ اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اس نے رضائے الٰہی کے حصول و عدمِ حصول کو فائدے اور نقصان کا معیار قرار دیا ہے۔ جو مادّی اور نفسانی آلائشوں سے بالکل پاک ہے۔ اور اس معیار کے مطابق ایک نیکوکار انسان اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان، مال، اولاد، نیک نامی، شہرت ہر چیز کو قربان کر کے بھی یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ فائدہ میں ہے۔ اور ایک بدکار انسان خدا کا غضب مول لینے کے بعد دنیا کے تمام مادّی اور نفسانی فوائد حاصل کر کے بھی یہ خوف رکھتا ہے کہ وہ نقصان میں ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو تمام دنیوی فائدوں اور نقصانوں سے بے نیاز کر کے خلوصِ نیت کے ساتھ تقویٰ اور نیکوکاری اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

تفسیر سورۂ والعصر

از

جناب مولانا عبد القدیر صدیقی استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

(و) اصل میں عطف کے لئے آتا ہے اور اس کے معنی ہیں "اور" مگر ایک خاص مناسبت سے قسم اور شہادت کے لیے بھی آتا ہے۔ کیونکہ قسم کھانے والا اس طرح کہا کرتا ہے :-

"یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں اس پر فلاں شاہد ہے اور وہ بھی وہی کہے گا۔ جو میں کہہ رہا ہوں" واللّٰہ یعلم انی رسول اللّٰہ اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس کا رسول ہوں۔ یہ بھی قسم ہے۔ "خدا شاہد خدا شاہد یہ کیوں کہتے ہو وعدوں پر" یہ بھی قسم ہے

العصر کے معنی نچوڑنے کے ہیں۔ اِنِّیْ اَعْصِرُ خَمْرًا۔ میں شراب بنانے کے لئے انگور نچوڑتا ہوں۔ پھر غروب سے پہلے زمانہ کو عصر کہنے لگے۔ کیوں کہ عموماً وہ دودھ دوہنے کا وقت ہوتا ہے۔ گویا کہ اس کی اصل زَمَانُ الْعَصْرِ ہے پھر مطلق زمانے کے معنی میں آتا ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عصر سے زمانہ ہی مراد ہے دوسرے اور معنے نامناسب اور غیر چسپاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، آئندہ جو بیان کیا جائے گا۔ اس پر زمانہ شاہد ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کرو۔ ملک ملک کے واقعات پوچھو۔ ہر قوم اور ہر ملت کے حالات و واقعات دریافت کرو۔ ہر ایک زبان حال و زبان قال سے شہادت دیگا کہ یہ دعوی سچا ہے۔ ایسا ہی اب تک ہوا ہے۔ اس وقت بھی اسی طرح ہے اور آئندہ

بھی یوں ہی ہوتا رہے گا کہ

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ

(اِنَّ) "بیشک" جملے پر زور دینے، اور اس کی تاکید کرنے کے لئے آتا ہے۔

(الۡاِنۡسَانَ) لام کئی طرح پر آتا ہے۔ یہاں استغراق کے لئے ہے۔ یعنے "تمام" "ہر ایک"۔ یعنے ہر ایک انسان خواہ عرب ہو یا عجم۔ کالا ہو یا گورا۔ جو ہو۔

(ل) "البتہ" "بیشک"۔ یہ بھی تاکید کے لئے اور زور بڑھانے کے لئے آتا ہے۔

(فِیۡ) میں۔

(خُسۡرٍ) نقصان گھاٹا ٹوٹا۔

(وَالۡعَصۡرِ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ) زمانہ شہادت دیتا ہے کہ ہر ایک انسان نقصان اور ٹوٹے میں ہے۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

(اِلَّا) حرف استثنا ہے۔ معنی۔ مگر۔ سوائے۔ بجز۔

(اٰمَنُوۡا) ایمان لائے۔ یقین کیا۔ حقیقت کی تصدیق کی۔

(و) عطف کے لئے ہے، اور۔

(عملوا) عمل کیا۔ کام کیا۔

(الصلحت) مناسب۔ درست۔ نیک۔

(اِلَّا الخ۔ اس خسران و نقصان سے وہی لوگ مستثنیٰ ہیں، جنہوں نے ایمان رکھا اور نیک عمل کئے یا یوں کہو کہ جنہوں نے یقین رکھا اور مناسب کام کئے یعنی ان کی قوت علمی و عملی دونوں

درست ہوں ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کامیابی صرف ان لوگوں کو ہے۔ جن کا ایمان قوی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ ڈھل مل یقین نہیں۔ جس شخص کو یقین نہیں وہ کوئی بھی کام نہیں کرسکتا کرتا بھی ہے تو بے دلی سے جس سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔ جس کا عقیدہ بھی درست ہو تو کافی نہیں۔ عمل صالح۔ مناسب کاموں کی بھی ضرورت ہے۔ علم بے عمل وبال ہے۔ اور عمل بے علم ضلال ہے۔ علم درخت ہے وعمل اس کا ثمر ہے۔ ثمرہ بے درخت کے محال ہے۔ اور درخت بے ثمرہ بے کار ہے۔ جس قدر علم صحیح اور قوی تر ہوگا اسی قدر عمل درست اور بہتر ہوگا۔

(بِالْحَقِّ)۔ حق بات کی۔ سچ اور راستی کی۔

اکیلے ایک آدمی کا اچھا ہونا خوش عقیدہ ہونا۔ مناسب کام کرنا کافی نہیں۔ انسان کو اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک ماحول درست نہ ہو۔ انسان کے فرائض میں داخل ہے کہ اپنے گھر والوں۔ دوست آشنا۔ اھل ملک۔ بنی نوع انسان کو نصیحت کرے۔ ان کی بھلائی چاہے۔ ان کو نیک مشورہ دے۔ تبلیغ دین کرے۔ اگر ایک کشتی میں چند لوگ ہوں اور ایک شخص اس میں سوراخ کرنا چاہے تو ہر صاحب عقل فہم کا فرض ہے کہ اس کو نصیحت کرے۔ اس کو روکے۔ ورنہ خود بھی اس کے ساتھ تباہ ہوگا۔ تبلیغ دین اسلام کا خاصہ ہے۔ دوسرے مذاہب نے اسلام کے دیکھا دیکھی تبلیغ شروع کی ہے۔

تَوَاصَوْا سے یہ بھی نکلتا ہے کہ آدمی چاہے کتنا بھی لائق ہو۔ ہوشمند ہو۔ تجربہ کار ہو۔ اس سے غلطی ہونی ممکن ہے۔ اگر معمولی آدمی۔ ایک جاہل یا ایک بچہ۔ حق بات کہے۔ تو کٹ حجتی نہ کرے۔ موتی کو دیکھنا چاہئے۔ غوطہ خور کی خساست پر نظر نہ کرنا چاہئے حکمت کی بات ایمان دار کی گم گشتہ چیز ہے۔ جہاں سے ملے اٹھا لینا چاہئے۔

(وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ)۔ اور باہم صبر و استقلال اور مداومت کی بھی وصیت کرنی چاہئے۔

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ کام کی ابتدا میں بڑا جوش رہتا ہے۔ چند روز کے بعد جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جس طرح عمل پر برانگیختہ کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح اس پر مداومت کرنے کی تاکید کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ جب آدمی کام کرنے لگتا ہے تو عمل کی سختی ایک طرف دنیا دشمن ہو جاتی ہے قسم قسم کی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے جاہل ہے۔ کوئی کہتا ہے خود غرض ہے بعض لوگ حسد کرتے ہیں طرح طرح کے موانع پیدا کرتے ہیں جو شخص صبر و استقلال سے کام لیتا ہے مشکلات سے متاثر نہیں ہوتا۔ نہ مایوس ہوتا ہے نہ ہمت ہارتا ہے۔ تو اسی کو کامیابی ہوتی ہے۔ اسی کو مقصود ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حصول مقصود میں۔ (۱) علم و یقین۔ (۲) مناسب عمل (۳) تعلیم و تعلم و مشاورت (۴) صبر و استقلال و مداومت کی ضرورت ہے۔

اس سورہ کی تعلیم انسان کو زندگی کے ہر شعبہ کے لئے شمع ہدایت ہے۔

ہر شخص جو کام کرنا چاہتا ہے اور اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس کو چاہیئے پہلے اس مقصد کے حاصل کرنے کا علم سیکھے۔ اور اسی چیز کو اختیار کرے جس میں کامیابی کا یقین ہو غیر یقینی الحصول مقصود کی طرف کبھی توجہ نہ کرے۔ اس کے بعد مناسب اعمال اختیار کرے۔ تمام عمر تخیلات میں نہ گذارے۔ بلکہ کام کرے کام میں آدمی کو اپنی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔ لہٰذا بڑوں اور تجربہ کاروں کے زیر نگرانی کام کرے۔ ان کی ہدایتوں پر کاربند رہے چھوٹا بھی صحیح مشورہ دے تو قبول کرے خود بھی استقلال سے کام کرے۔ اور دوسروں کو اس کی ترغیب دے۔ ان تمام امور پر کاربند رہے گا تو ضرور دامن طلب دُرِ مقصود سے بھر جائیگا۔

قصص القرآن

مسلم اوّل

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ (شملہ)

دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں سے جسے دیکھئے کوئی تو اپنے بانی کے نام سے منسوب ہے جیسے بدھمت عیسائیت وغیرہ اور کوئی اس قوم کے نام سے معروف جس قوم کی طرف وہ داعی مذہب مبعوث ہوئے۔ مثلاً ہندومت یہودیت وغیرہ لیکن اس کلیہ میں اگر کہیں استثنا نظر آئے گا۔ تو دنیا کے سب سے بڑے مذہب اسلام میں جو نہ تو اپنے داعی (صلعم) کے نام سے منسوب ہے اور نہ اس قوم کے نام سے موسوم جس میں اس داعی الی الحق کی بعثت ہوئی یہی وجہ تھی کہ جب یورپ اسلام کے نام سے شناسا ہوا تو وہ اس حقیقت کو باور ہی نہیں کر سکا۔ کہ مذہب بانی مذہب کے نام کے بغیر بھی محال سے باہر آسکتا ہے۔ اور دنیا میں اس کا چلن اس طریق سے بھی ممکن ہے۔ لہذا دنیا کی اس سنت قدیمہ اور کچھ اپنی ذہنی افتاد کی بنا پر اس نے اسلام کا نام محمدیت اور اس کے متبعین کا نام محمدی رکھدیا۔ یورپ تو خیر ناواقف تھا۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ ہمارے بعض مسلمان روشن خیال حضرات نے بھی بہ اتباع یورپ اسلام اور مسلم کو یورپ کے وضع کردہ نام سے پکارنا شروع کردیا اور آج بلاتکلف محمدیت (Mohammadanism.) اور محمدی (Mohammadans.) کے الفاظ سننے میں آرہے ہیں۔ حالانکہ داعی اسلام (صلعم) کی بے غرض دعوت الی اللہ کے ثبوت میں منجملہ دیگر دلائل و براہین کے ایک یہ بھی حیرت انگیز دلیل ہے کہ ان کی اس عظیم الشان دعوت میں نام کی شہرت تک کے جذبے کو بھی دخل نہیں۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ نام بھی داعی اسلامؐ کے وضع فرمودہ نہیں تو بالآخر اتنے بڑے جلیل المرتبت مذہب کا نام اسلام کس نے رکھا۔ اور اس کے پیرودں کو مسلم کے لقب سے کس نے یاد فرمایا۔ اور عام دنیائے مذہب کے قاعدے خلاف ایسا کیوں کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس سوال کا جواب بڑی شرح وبسط سے دیا ہے، اور مختلف گوشوں اور متنوع عنوانوں سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ اسلام کسی انسان کا وضع کردہ مذہب نہیں ہے۔ ایک صداقت ہے اور دنیا میں اس وقت سے موجود ہے جس وقت سے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں صداقت ہے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام وملل عالم میں اس صداقت مبین کے داعی حسب ضرورت منجانب اللہ مبعوث ہوتے رہے لیکن ان کی بنائی ہوئی عمارتیں یکے بعد دیگرے انسانی سرکشی و تمرد کے سیلاب میں بہتی چلی گئیں۔ ان حقیقتوں پر انسانی تعریفات نے پردے ڈال دئے اور اس طرح سے اس صداقت کا حسن اصلی دنیا کی نگاہوں سے مستور ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ جب اس رب العالمین کو منظور ہوا تو اسی شراب وحدت کو قرآنی آبگینوں میں بھر کر انھیں سربمہر کر دیا کہ اثرات زمانے کے تغیرات سے محفوظ و مصئون رہے۔ اور خود اس کے تحفظ و بقار کا ذمہ لے لیا۔ نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ قرآن نے دنیا میں آکر اگرچہ کوئی نئی عمارت نہیں قائم کی لیکن الٰہی آثار قدیمہ کے کھنڈرات میں سے حشو و زوائد کو پاک کر کے اسی ازلی عمارت کو اس درجہ محکم و استوار کر دیا کہ حوادث ارضی کے متموج تھپیڑے آ کر ٹکرا تیں اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلے جائیں۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ میں کتب سابقہ و صحف گذشتہ کی تکذیب کے لئے نہیں بلکہ اس کی اصل تعلیم کی تصدیق کے لئے آیا ہوں جو اس وقت تلاش سے بھی دنیا کو کہیں نہیں مل سکتی تھی اس نے تمام ادیان سابقہ اور امم گذشتہ پر احسان عظیم کیا کہ ان کی کھوئی ہوئی دولت گرانمایہ کو، جس کے متعلق انھیں علم تک بھی نہ تھا کہ کہاں کہاں سے اڑی اور کہاں کہاں بکھری، ایک محفوظ خزانہ میں بند کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ اور اس آواز صداقت، اس دعوت حقانیت کا نام بھی کوئی

بنیانہ رکھا کہ لوگوں کو مغالطہ نہ لگ جائے۔ بلکہ نام بھی وہی رہنے دیا جو ان ادیان حقہ کے مورث اعلیٰ نے تجویز فرمایا تھا۔ اسلام جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ ایک صداقت ازلی ہے۔ لیکن سب سے پہلے اس صداقت مبین کو ایک شریعت الٰہیہ کی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اور اس پر ایمان لانے والوں کا نام مسلم بھی انہیں کا تجویز کردہ ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ دین کوئی شخصی دین نہیں بَلْ مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ۔ هُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ یعنے دعوت توحید کے اولین واعظ جناب ابراہیم کی ملت ہے جنھوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ نام ہی نہیں بلکہ اس دین مبین کی حقیقت بھی یہی بیان فرمائی کہ۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰانِیْ رَبِّیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا۔ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (۶: ۲۰)

(اے رسول عربی) کہد بجئے کہ میرے رب نے ایک صراط مستقیم کی طرف میری رہنمائی کی ہے۔ یہی دین قیم ہے ابراہیم حنیف کی ملت۔ اور ابراہیم مشرکین میں نہ تھے۔

گویا اسماً و معناً یہ دین قیم حضرت ابراہیم کی ملت ہے جو اسلام کے واعظ اول اور موحدین کے مورث اعلیٰ

لہ مشہور مشنری ڈاکٹر ٹسڈل نے اپنی کتاب ینابیع الاسلام میں قرآن کریم پر ایک بہت بڑا الزام یہ بھی عاید کیا ہے کہ اس کی تعلیم واحدانیت کا ماخذ تعلیم ابراہیم ہے اور بعض مناسک وعبادات میں بھی قرآنی تعلیم الٰہی کی تبع ہے۔ اور اس سے نتیجہ یہ مستنبط کرتا ہے کہ تعلیم قرآنی کا سرچشمہ ہدایت علم آلٰہی و وحی ربانی نہیں بلکہ یہ محض شرایع سابقہ کی زلہ چینی ہے۔ یہ کتاب اور اس کے یہ گراں بہا حقائق و معارف مترجم کتاب سر ولیم میور کے نزدیک اس قدر متہم بالشان ہیں کہ انہوں نے بڑے زور کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ تمام السنہ شرقیہ میں ہو جانا چاہئے۔ تاکہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں۔ ماخذ اسلام کو بے نقاب دیکھ لیں گویا سر ولیم میور کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی ریسرچ (تحقیق) اس قدر بلند پایہ ہے کہ اس حقیقت کی پردہ کشائی کے بعد تمام قرآنی دعاوی کی عمارت ڈھیر ہو کر رہ جائے گی۔ مصنف و مترجم کتاب اور ان کے دعاوی کے متعلق تو کچھ کہنا ہی بیکار ہے کیونکہ انکا تو یہ مشن ہی ٹھیرا کہ عوام کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھائیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کونسی خصوصیات کے حامل تھے کہ انہیں قرآن کریم نے پرستش وعبادت خدائے واحد کے اولین داعی کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان کے تجویز فرمودہ نام سے اس دین حقہ کو یاد کیا ہے۔ جو نظم ونسق عالم میں قانون فطرت کی طرح جاری ہے۔ اور اس نام سے اس امت کو موسوم کیا ہے جس کے متعلق خود اس کا ارشاد ہے کہ

کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔

جن کے فرائض میں یہ چیز داخل کر دی ہے کہ۔

تَأمُرُونَ بِالمَعرُوفِ تنهون عن المُنكَرِ تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔

اور جنہیں اُمت وسطاً قرار دیکر تمام انسانوں پر گواہ فرمایا ہے۔

قرآن حکیم میں ایک بڑا حصہ انبیاء سابقین کے قصص واعمال اور امم گذشتہ کے سوانح واحوال کا ہے لیکن یہ قصے اور کہانیاں ایک افسانہ گو کی طرح بیان نہیں کی گئیں کہ دفع الوقتی کے کام آئیں۔ کفار نے قرآن پر جب یہ اعتراض کیا کہ اِن ھٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیرُ الاَوَّلِینَ (کہ یہ تو بس اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں) تو قرآن نے فوراً جواب دیا کہ یہ قصے محض افسانے نہیں بلکہ بصائر وحکم (ھٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ) اور عبر وموعظت (ھذہ تذکرہ) کا مرقع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں۔ عہد عتیق کے قصص وحکایات

لیکن ہم اپنے ان نادان مسلمان روشن خیال حضرات سے جو مستشرقین یورپ کے ہر ایک قول کو وحی منزل سے بھی زیادہ واجب التسلیم سمجھتے ہیں اتنا ضرور عرض کریں گے کہ وہ علماء یورپ کی اس درجہ قرآن فہمی کی ذرا داد دیں کہ جس چیز کو قرآن نے اپنی دعوت کا بنیادی اصول قرار دیا ہے وہ اسی چیز کو بڑے دور دراز گوشوں سے جا کر تلاش کر کے لاتے ہیں۔ اور اسے اس قدر بڑے الزام کی صورت میں پیش کرتے ہیں کہ گویا مسلمانوں سے اس کا جواب نہیں بن آئیگا اور ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ یہ "تحقیق" ہر ایک مسلمان کے کان تک ضرور پہنچا دی جائے۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے پرویز

کی طرح ۔ کوئی قصہ شروع سے اخیر تک بطور کہانی کے بیان نہیں ہوا ۔ بلکہ اس کا عام انداز بیان یہ ہے کہ وہ پہلے ایک خاص تعلیم پیش کرتا ہے اور پھر اس تعلیم کی صداقت کے ثبوت میں امم سابقہ اور انبیاء گذشتہ کے حالات و واقعات سے ایک خطابی استدلال کرتا ہے تاکہ تعلیم اور اس کے نتائج بیک وقت سامنے آجائیں ۔ چنانچہ ان قصص و حالات کے مختلف ٹکڑے حسب موقع مختلف مقامات پر نظر آئیں گے انہی واقعات میں حضرت ابراہیم کے کوائف حیات منتشر موتیوں کی طرح جابجا بکھرے پڑے ہیں لیکن اس افراط سے کہ انہیں اگر ایک سلسلہ میں دیکھا جائے تو حضور علیہ السلام کی حیات مقدسہ کے مختلف پہلوؤں پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے ۔ اور یہ اس لئے کہ تمام قرآن میں اگر مسلمانوں کے لئے کسی زندگی کے از سرتا پا اعمال بطور نمونے کے پیش کئے گئے ہیں اور ان کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے تو وہ صرف دو نمونے ہیں ، خود شریعت اسلامیہ کے داعی کریم (صلعم) کی نسبت فرمایا

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ — بیشک تمہارے رسول اللہ صلعم کی زندگی (مبارک) پیروی اور اتباع کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے ۔ (احزاب)

اور پھر ملت حنیفی کے داعی اول کی نسبت ارشاد ہوا ۔

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (ممتحنہ) — بیشک تمہارے لئے بہترین نمونہ (حضرت) ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے اعمال حیات میں ہے ۔

یہ بات یقیناً غور طلب ہے کہ تمام قرآن میں بیسیوں انبیاء سابقین کے کوائف حیات بیان کئے گئے ہیں لیکن اتباع کے لئے کسی کی تمام زندگی کو بطور نمونے کے پیش نہیں کیا گیا الا حضرت ابراہیم اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ۔

اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۶:۲) — جب حضرت ابراہیم سے ان کے رب نے کہا کہ مسلم (فرمانبردار) بن جاؤ تو انہوں نے کہا کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا فرمانبردار بن گیا ۔

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کے پہلے داعی علیہ السلام کی زندگی تمام تر پیکر اسلام تھی اور ان کا ہر عمل حیات اپنے اندر حقیقت اسلام کا ایک عملی نمونہ رکھتا تھا۔ اس لئے اسلام کے صحیح معنے بھی اسوۂ ابراہیمی ہی میں ملنگے

اسلام کا مادہ لفظ سلم ہے۔ جو مختلف اشکال میں آکر مختلف معانی پیدا کرتا ہے۔ لیکن لغت میں سلم کے معنی اطاعت۔ گردن جھکانے ۔ اور کسی چیز کے سونپ دینے کے ہیں۔ اور قرآن کریم میں ان معانی کے شواہد بکثرت ہیں۔ لہٰذا سب سے نمایاں یہی حقیقت اسلام ہوگی۔ جو حضرت ابراہیم کی زندگی پر طاری ہوگی لیکن اس آخری نتیجہ پر پہنچنے کے لئے حضور صلعم کی حیات مقدسہ کا شروع سے مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ وہ مُسلم اول جن منازل کو طے کرکے اس مقام تسلیم و رضا تک پہنچا وہ تمام سامنے آجائیں اور استنباط نتائج میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

آج سے قریباً پانچ ہزار تین سو برس پیشتر۔ سرزمین عراق میں ایک جابر و متمرد قوم حکمران تھی۔ جو اُس زمانے کے تمدن و معاشرت کی مالک تھی۔ مادی ترقی کے نشے نے انھیں خدا سے بھلا رکھا تھا۔ اور بندگان خدا کے ساتھ ظلم و استبداد کے تمام سلوک روا رکھے جاتے تھے۔ بادشاہ وقت بطور دیوتاؤں کے پوجا جاتا تھا اجرام سماوی مثل چاند۔ سورج اور تاروں کی پرستش ہوتی تھی۔ اور یہی نہیں بلکہ مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے وہ سر جھکا رہے تھے جو تاج خلافت و نیابت الٰہی سے مزین ہونے کے لئے بنے تھے۔ جب قدرت کاملہ کو یہ تاریکی و ظلمت مٹانی منظور ہوئی تو اسی قوم کے اندر اسی مرکز جہالت و ظلمت سے ایک ایسے عظیم الشان خدا شناس کو اٹھایا جو دنیا کے لئے پیام توحید کا مرکز بھی اور محیط بھی ہوا۔ جس کے نور مبین کی ضیا ریاشیوں نے ظلمت و ضلالت کے پردوں کو چاک چاک کر دیا اور جس نے تارہ پرست قوم کو آسمانوں اور زمینوں کے خدا سے روشناس کرا دیا۔ یہ بزرگ و برتر ہستی حضرت ابراہیم کے نام نامی سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔

انہوں نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گرد و پیش بت پرستی کے مناظر دیکھے۔ خود اپنے گھر کے اندر بتوں کے قالب موجود پائے۔ جب وہ کالڈیا کے بازاروں میں جاتے تو لوگوں کو بتوں کے سامنے سربسجود دیکھتے جب خدا کی کھلی فضا میں نکلتے تو وہی سر اجرام سماوی کے سامنے جھکے ہوئے ملتے۔ انہوں نے اس ماحول میں پرورش پائی لیکن عامۃ الناس اور ایک نبی میں یہی فرق ہے۔ انسان۔ بقول ایک مشہور انگریز مصنف کے۔ گرد و پیش کے واقعات کا مرقع ہوتا ہے۔ وہ وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے۔ جو کچھ دیکھتا ہے لیکن نبی اپنے ماحول کے اثرات سے یکسر غیر متاثر رہتا ہے اور اس وقت جبکہ اس کے سامنے کوئی مثال موجود نہیں ہوتی وہ بغیر کسی انسانی ذرائع کے ایک ان سنے نغمے کی لے سے مست ہوتا ہے جو اندر ہی اندر اسے ایک ان دیکھے خدائے قدوس کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ اور وہ تمام گرد و پیش کی ان چیزوں سے منہ موڑ کر جو آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی جاتی ہیں۔ اس ایک معبود حقیقی کی طرف رجوع کر لیتا ہے جسے اس وقت اس کے سوا اور کوئی آنکھ دیکھنے والی نہیں ہوتی یہی وہ ملکہ نبوت ہے۔ جو جملہ ملکات اکتسابیہ سے بالکل جداگانہ ہے اور یہ اس وقت وہبی طور پر عطا ہوتا ہے جبکہ "اہل اکتساب" کے ہاں اس کے تصور کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ (۲۱: ۵)۔ ابراہیم کو ہم نے ابتدائے عمر سے ہی فہم سلیم عطا فرمادی تھی اور ہم اس سے اچھی طرح واقف تھے۔

ہرچند کواکب پرست قوم کا مجمع گرد و پیش تھا لیکن تاروں کی نظر فریبی۔ چاند کا حسن و جمال اور سورج کی عظمت و شوکت ان کے قلب سلیم کو مرعوب نہ کر سکی اور اسی وہبی رشد و ہدایت کی آواز نے برملا کہدیا کہ اِنِّی لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (میں غروب ہوجانے والی ہستیوں کو دوست نہیں رکھتا۔ یعنی وہ اجرام فلکی جو اپنے وجود و عدم۔ طلوع و غروب اور ضیاء و ظلمت پر خود قادر نہیں ملکہ کسی اور نظام کے ماتحت سرگرداں پھر رہے ہیں۔ وہ خدا نہیں ہوسکتے۔ ان باطل ہستیوں کی بجائے اس ہستی مطلق

کی طرف رجوع کیوں نہ کیا جائے جس کی مشیت اور ارادے کے ماتحت یہ تمام سلسلہ کائنات اپنے وظائف حیات میں مصروف اطاعت ہے۔

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۶: ۷۹)	میں ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اس ذات کی طرف پھر گیا ہوں۔ جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔
وَکَذٰلِکَ نُرِیْۤ اِبْرٰھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ (۶: ۷۵)	اسی طرح ہم نے ابراہیم کو زمین و آسمان کا انتظام دکھا دیا تاکہ وہ (انہیں ہماری قدرت کی نشانیاں سمجھ کر) کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

ایمان و ایقان کے ان مراحل کے بعد دعوت الی الحق اور امر بالمعروف کا فریضہ عائد ہوا۔ اور حکم ہوا کہ اس کی ابتدا اپنے ہی گھر سے کی جائے چنانچہ سب سے پہلے اپنے باپ کو (اب ا بت پرستی کے خلاف وعظ فرمایا۔ سورہ مریم میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بابا جان! آپ ان پتھر کے ٹکڑوں کی کیا پرستش کرتے ہیں۔ جو نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں۔ اور نہ آپ کو کچھ نفع پہنچانے پر قادر ہیں۔ اے میرے باپ! مجھے بصارت و حکم کا وہ علم دیا گیا ہے کہ آپ کو اس کا کچھ علم نہیں۔ اگر منزل مقصود پر پہنچنا منظور ہے تو میرے نقش قدم پر چلئے۔ اے باپ۔ شیطان کی پرستش نہ کیجئے کہ شیطان تو درگاہ ایزدی کا دھتکارا ہوا سرکش ہے۔ اے باپ۔ مجھے خوف ہے کہ آپ لوگوں کی اس سرکشی اور اعراض عن الحق کی وجہ سے آپ پر خدا کا عذاب نہ آجائے۔ اس لئے اس خدا کی طرف رجوع کیجئے"۔

لیکن حق و صداقت کی آواز سے ہمیشہ منہ موڑا گیا ہے۔ ان کے باپ نے ان کی ایک نہ سنی بلکہ الٹا ان کو دھمکایا کہ اگر وہ ان کے معبودان باطل کے خلاف کچھ کہیں گے تو سخت سزا دی جائے گی۔

یہ واعظ حقانیت معلم صداقت اپنی آواز ان تک پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے

ماننا نہ ماننا ان کا کام تھا۔ اب اس کے بعد دعوت عام کا وقت آگیا۔ اور صعوبات و تکالیف کی پرخار وادی شروع ہوگئی۔ جس میں سے ہر داعی الی اللہ کو گذرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شجاعت قلب جرأت لسان اور قوت بازو کی آزمایش ہوتی ہے پہلی منزل میں اگر اعزا و احبا کی مودت و محبت کے خلاف جہاد ہوتا ہے تو اس دوسری منزل میں جملہ ماسوی اللہ سے قطع علائق اور جان و مال کی قربانی کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ اسے اس راہ میں نہایت سنگلاخ منازل سے گذرنا ہوگا مشکل سے مشکل امتحان دینے ہوں گے۔ اور قدم قدم پر ہمت و حوصلہ کی آزمایش ہوگی۔ یہ وہی راہ ہے کہ جس میں۔

صد منزل است و منزل اول قیامت است

ایسی سرکش و متمرد قوم کے معبودوں کے خلاف لب کشائی کرنا کچھ آسان کام نہ تھا لیکن جو پہلے ہی سر بکف میدان میں آئے اسے خوف کس بات کا۔ کہا اور برملا کہا، کہا اور علانیہ کہا چنانچہ سورہ انبیاء میں نہایت دلکش پیرایہ میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۔ جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیا پتھر کی مورتیں ہیں، جن کی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے بڑوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ (اس کے سوا تو ہم کچھ جانتے نہیں) آپ نے کہا یقیناً تم اور تمہارے بڑے بوڑھے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے رہے یہ سن کر انہوں نے کہا کہ یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا سچ مچ کہتے ہو یا یونہی دل لگی کر رہے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ بھلا اس میں دل لگی کی کونسی بات ہے۔ یہ تو امر حقیقت ہے کہ تمہارا پروردگار صرف وہی ذات ہے جس نے پستیوں اور بلندیوں سب کو پیدا کیا۔ اور میں حق و یقین سے اس کی شہادت دیتا ہوں۔ آپ نے یہ بھی فرمادیا کہ میں ضرور تمہارے معبودوں کے ساتھ تمہارے جانے کے بعد ایک چال چلوں گا۔ (دیکھوں تو بھلا یہ اپنی حفاظت کس طرح کرسکتے ہیں)

"چنانچہ حضرت ابراہیم ان کے بت خانہ میں گئے اور بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور سب سے بڑے پیر صنمکدہ کو چھوڑ دیا کہ وہ لوگ شاید اس کی طرف رجوع کریں۔ جب ان لوگوں نے واپس آکر یہ ماجرا دیکھا تو لگے آپس میں کہنے کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا۔ جس نے ایسا کیا ہے۔ یقیناً اسنے اپنے آپ پر سخت ظلم کیا ہے۔ اس پر بعضوں نے کہا کہ وہ جو ایک نوجوان ہے جسے ابراہیم کہتے ہیں۔ وہ ان بتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ ہو نہ ہو یہ اُسی کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔ (اس پر وہ سخت برہم ہوئے اور) انہوں نے کہا کہ اس نوجوان کو گرفتار کر لاؤ تاکہ سب کے سامنے امر واقعہ کی تحقیق ہو جائے۔ اور یہ لوگ گواہ رہیں۔ چنانچہ لوگ حضرت ابراہیم کو لیکر آئے اور انہوں نے پوچھا کہ اے ابراہیم ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ گستاخی تم نے کی ہے۔ آپ نے الزاماً فرمایا کہ اس بڑے بزرگ نے یہ کچھ کیا ہوگا۔ بھلا ان سے پوچھو تو سہی اگر یہ جواب دے سکتے ہیں۔ یہ جواب سنکر وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور لگے آپس میں کہنے کہ تمھیں برسر ناحق ہو لیکن گمراہی اور ہٹ دھرمی کا زنگ اتنی جلدی اتر نہیں سکتا تھا۔ الٹے حضرت ابراہیم سے کہنے لگے کہ واہ۔ یہ تم نے کیا بات کہی۔ تم تو خود جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ کیا اوندھی عقل ہے کہ تم جانتے بوجھتے ہوئے اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو۔ جو خود ہی مجبور محض ہیں۔ چہ جائے کہ تمھیں کچھ نفع نقصان پہونچا سکیں تف ہے تمہاری عقلوں پر اور ان چیزوں پر جنھیں تم معبود بنائے بیٹھے ہو۔ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔"

حق و صداقت کی اس باطل شکن آواز کے سامنے جب کچھ بن نہ پڑا۔ تو اپنے ان اوچھے ہتیاروں پر اتر آئے۔ جو ہر اس باطل پرست کا آخری حربہ ہوتا ہے جسے اپنی مادی قوتوں کے استیلا پر ناز ہوتا ہے۔ انہوں نے کہدیا کہ اگر یہ اپنے اس وعظ سے باز نہیں آتا تو "ایسے شخص کو آگ میں ڈال کر جلا دو۔ اور اسطرح اپنے معبودوں کا بول بالا ہونے دو"۔

اللہ اللہ وہ بھی کس قدر صبر آزما مرحلہ تھا۔ سامنے آگ کی شعلہ سامانیاں آمادہ استہلاک

دکھائی دے رہی ہیں یقین ہو چکا ہے کہ اگر اپنی بات میں جما رہا تو آگ میں جھونک دیا جاؤں گا لیکن شجاعت قلب ہے کہ تیور پہ بل نہیں پڑنے دیتی۔ صداقت وحق گوئی سے زبان نہیں رکتی۔ صبر و استقلال کے قدم میں ذرا لغزش نہیں آتی۔ اطمینان قلب ہے کہ خوف و ہراس کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا اور ایمان وایقان ہے کہ اس غلبہ واستیلا کو تار عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب دل اور دماغ کی کی باہمی جنگ شروع ہو جایا کرتی ہے۔ اور اس کشمکش میں کہ

کھینچے ہے مجھے کعبہ تو روکے ہے مجھے دیر

بڑے بڑے صاحب ہمت "منطقی توجیہات" کی خود فریبی میں آکر بارگاہ عشق سے ہمیشہ کے لئے راندے جاتے ہیں لیکن اس پیکر عبودیت۔ کشتہ محبت یعنے خلیل اکبر کا مقام اس سے بہت بلند و بالا تھا وہ خراماں خراماں بڑھا۔ آگ کے جوش کو دیکھکر تبسم ہوا۔ اور۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یہ تو ایک آزمایش اور اتباع کے لئے نمونہ پیش کر کے دکھانا تھا۔ ورنہ کس کا جلنا اور کس کا جلانا رحمت الٰہی جوش میں آئی اور سحاب کرم کے ایک چھینٹے نے کلدانیوں کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ۔ ٹھنڈی اور سلامتی والی ٹھنڈی کہ کہیں برف ہی نہ ہو جائے۔

لیکن ابھی مسلم کا خطاب نہیں عطا ہوا۔ اس کے لئے ابھی اور منازل باقی ہیں۔

استقلال و تحمل کے علاوہ ایک داعی الی الحق کے لئے اس خصوصیت کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت کو نہایت مؤثر اور دلنشین پیرایہ میں بیان کرے۔ اس کا انداز تخاطب ایک مناظرانہ بحث وجدل نہیں بلکہ واعظانہ رشد و ہدایت کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کی بات اگرچہ اپنے سیدھے سادے فطری اصول کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن ایسی تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہ تیر نشانے پر جا کر لگے۔ اس لئے کہ اس کا

مقصد اسکات خصم نہیں بلکہ تسکین قلوب ہوتا ہے وہ محض گرمی محفل کے لئے سخن پروری سے کام نہیں لیتا بلکہ فطری اسلوب بیان سے ایمان وایقان کی بنیادیں مضبوط کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ جاہلانہ کج بحثی کرنے والوں سے جدل وخصومت سے پیش نہیں آتا بلکہ ان کی فکری استعداد کے مطابق معارض کے دل کی گمراہی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کے ہم عصر بادشاہ نے خدا کے بارے میں حجت کی مثال کے طور پر قرآن حکیم نے اس مکالمہ کو سورہ بقر میں بیان فرمایا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۔ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ط قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ط وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۔

کیا تونے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے پروردگار کے بارے میں حجت کی تھی۔ کیونکہ اللہ نے اسے بادشاہت دی تھی جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے بادشاہ نے کہا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں (حضرت) ابراہیم نے یہ سنکر فرمایا کہ خدا مشرق سے سورج کو نکالتا ہے۔ تو ذرا مغرب سے تو نکال دے۔ اس پر وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

دیکھ لیجئے وہی مجادلانہ کج بحثی سے اعراض اور مخاصمانہ سوال وجواب سے اجتناب۔ پہلی دلیل ہر چند اوضح اور وزنی تھی لیکن اس نے جب طفلانہ ہٹ دھرمی کا ثبوت پیش کیا۔ تو بجائے اس کے کہ اس کی دلیل کی خامیوں کی قلعی کھول کے رکھ دیتے بحث ونظر سے ہٹ کر اس کی فکری (بلکہ اعتقادی) استعداد کے مطابق طریق دعوت اختیار کر لیا۔ جو سکت نہیں بلکہ ممکن تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب حقیقت اس طرح بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آگئی تو اس میں کج بحثی کرنے کی جرأت ہی نہ رہی۔ [1]

[1] ہمارے اکثر مفسرین نے اس سیدھے سادھے مکالمے کو مصطلحہ مناظرہ کا رنگ دے رکھا ہے۔ اور پھر اس پر منطقی استدلال

یہاں تک تو ان تکالیف و مشکلات کا ذکر تھا۔ لیکن اسوۂ ابراہیمی والی آیت میں والذین معہٗ کا بھی ذکر ہے۔ اس کے آگے وہ آزمائشیں آتی ہیں جن میں مال اولاد۔ بیوی بھی شامل ہیں۔ مال و اولاد کو فتنہ اسی لئے کہا گیا ہے کہ آدمی کی اپنی ذات تک جن مصائب کا اثر پڑتا ہو وہ تو برداشت کر لیتا ہے لیکن مال واولاد کی قربانی بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ مسلم کا خطاب حاصل کرنے کے لئے ان تمام منازل سے گذرنا ضروری ہے۔ آپ کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اور اس وقت تک اولاد عطا نہیں ہوئی تھی۔ اولاد کی خواہش ایک فطری اور جائز جذبہ ہے۔ خواہ وہ بھی اسی کی خدمت و اطاعت کے لئے ہی مانگی جائے۔ چنانچہ آپ کی دعاؤں کو شرف قبولیت عطا ہوا۔ اور ایک حلیم و بردبار فرزند کی بشارت دی گئی۔ (فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ) ان منتوں اور دعاؤں کا بچہ۔ پھر کبر سنی میں جتنی بھی خوشی ہو کم اور وہ جس قدر بھی پیارا ہو تھوڑا ہے۔ لیکن صحیح آزمائش اور اسوۂ حسنہ کے مظاہرہ کا وقت بھی اب ہی آیا تھا۔ حکم ہوا کہ بیوی اور شیرخوار بچے کو ایک وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آئیں جس میں زندگی کی سرسبزی و شگفتگی کا کہیں نشان نظر نہ آئے۔ اس بندۂ اطاعت نے بیوی اور بچے کو ساتھ لیا اور ایک بے برگ و گیاہ لق و دق صحرائے عرب میں جا کر چھوڑ آئے۔ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ۔ محبوب اور پیارے بچے اور رفیقہ حیات کو بر توکل علی اللہ اس

اور فلسفیانہ بحث و جدل کے عجیب عجیب حاشیے چڑھائے ہیں اور فنی مناظرے کے تمام اصول و اسلوب اس پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اشکال در اشکال سے معاملہ الجھتا چلا گیا جس کے سلجھانے کے لئے پھر کئی دور از کار تاویلات سے کام لیا گیا۔ اور کثرت تعبیر سے خواب اور بھی زیادہ پریشان ہوتا گیا۔ حالانکہ یہ ایک منطقی مناظرہ نہیں بلکہ رشد و ہدایت کے لئے ایک عام مکالمہ تھا۔ بہرحال یہ موضوع ایک مستقل بحث چاہتا ہے یہاں اتنا اشارہ ہی کافی ہے۔ اس باب میں مولانا آزاد کے تدبر فی القرآن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (پرویز)۔

اکس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دینا ہی کچھ آسان کام نہ تھا۔ لیکن نہیں ابھی اس سلسلہ ابتلا وامتحان کی آخری کڑی باقی تھی۔ وہ ایسا مقام تھا کہ جہاں فی الواقع ایک عبد مسلم ہی پہنچ سکتا ہے۔

بچہ بڑھا پھلا پھولا۔ برابر کا جوان ہوا۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ۔ اس قابل ہو گیا کہ باپ کے ساتھ کاروبار کو باہر جانے لگا۔ تو خواب میں حکم دیا گیا کہ اے ابراہیم اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کر دے۔

اللہ اکبر کہنے کو تو یہ حکم ایک جملہ واحد میں ادا ہو گیا لیکن۔

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

بال بچے والے کلیجہ تھام کر ذرا سوچیں تو سہی کہ اس حکم کی تعمیل میں کتنی قیامتیں پوشیدہ ہیں ایسا اللہ آمین کا بچہ۔ برابر کا جوان بیٹا۔ عصائے پیری۔ تمام زندگی کی امیدوں کا ایک ہی آسرا۔ اور اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیا جائے۔ اپنا مایۂ حیات اپنے ہاتھ لٹا دیا جائے۔ لیکن پریم کی ریت نیاری ہے دیار محبت کے قانون اس دنیا سے بالکل جداگانہ ہیں۔ وہاں تو اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ حکم ملا اور لبیک اللھم لبیک کہتے سر جھکا دیا۔ بیوی۔ ہاں اس مومنہ قانتہ بیوی نے بیٹے کو نہلایا دھلایا۔ گویا عید کے لئے بچے کو باپ کے ہمراہ بھیج رہی ہیں۔ راستہ میں باپ نے بیٹے سے پوچھا کہ

انی اری فی المنام انی اذبحک۔ فانظر ماذا تری — اے بیٹا میں نے خواب میں حکم پایا ہے اور دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تو تمہارا کیا خیال ہے۔

سوال آپ نے سن ہی لیا۔ اب اس بچے کا جواب بھی سن لیجئے۔ ذرا غور سے سنئے۔ کہ ایک مسلم گھرانے کے نونہالوں کی بات چیت ہو رہی ہے عرض کیا۔

يَا أَبَتِ افْعَلْ ما تومر۔ ستجدنی ان شاء اللہ من الصٰبرین۔ — کہ اباجان جو آپ کو حکم دیا گیا ہے بلا تامل کر گذرئیے انشاء اللہ العزیز آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔

سبحان اللہ۔سبحان اللہ۔باپ تو ان ارادوں کا باپ۔ ماں تو اس حوصلہ کی ماں۔اور بیٹا تو اس حوصلہ کا بیٹا۔ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا چھری ہاتھ میں لے لی آسمان ساکت ہوگیا کہ اس کی آنکھوں نے ایسا تماشا کبھی نہ دیکھا تھا۔ زمین تھرا اٹھی کہ خون اسمٰعیل کے ایک مقدس قطرہ کی بھی وہ متحمل نہ ہوسکتی تھی فرشتے محو حیرت تھے کہ اے اللہ۔خون ریز اور مفسد انسانوں کی بستیوں میں تیرے ایسے ایسے بندے بھی موجود ہیں۔باپ نے اپنی محبت اور جذبات اور بیٹے نے اپنی جان و نفس کو محبوب حقیقی کے ایک اشارے پر قربان گاہ عشق میں بلاتکلف بھینٹ کے لئے حاضر کر دیا۔ اطاعت و انقیاد، تسلیم و رضا سپرد کر دینے اور سونپ دینے بیچ دینے اور سر جھکا دینے کی یہ آخری منزل تھی۔یہ وہ مقام تھا کہ جہاں پہنچ کر وہ صحیح معنوں میں مسلم ہوئے۔چنانچہ عین اس مقام پر ارشاد ہے ؛۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ۔ کہ جب وہ دونوں "مُسلم" ہوگئے۔اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۔ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۳۷: ۱۰۱) تو ہم نے آواز دی کہ صد مرحبا اے ابراہیم۔(تونے تو کمال کر دکھایا) بیشک تونے اپنے خواب کو سچا کر دیا نیکوکاروں کو ہم اسی طرح اجر دیا کرتے ہیں۔یقیناً یہ امتحان بہت بھاری تھا۔اس کے بدلے میں ہم تمہیں ایک بڑی قربانی دیتے ہیں۔جو قیامت تک باقی رہے گی درود و سلام ہو ابراہیم پر۔ہم اسی طرح اپنے نیک بندوں کو اجر دیتے ہیں۔بیشک ابراہیم ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں پہنچ کر ایک خدا پرست انسان مسلم و مومن کہلا سکتا ہے۔ یوں ہی منہ سے کہدینے سے کچھ نہیں بنتا۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس جاندادہ حمیت کی قربانیوں کا تقاضا تھا کہ ایک یادگار عظیم قائم کی جاتی جو قیامت تک باقی رہتی دنیا میں خدا پرست انسانوں کی عبادت کا کوئی مرکزی مقام نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بت کدہ عالم میں ایک "اپنا گھر" بنانا چاہا۔ اور اس کے لئے خشک و غیر ذی زرع وادی کی اسی صحرائی قربانگاہ کو منتخب کیا۔ اور اس یادگار عظیم کی تقریب میں اسی باپ بیٹے کو حکم دیا

ان طهرا بيتي للطائفين والعاكفين والركع السجود۔ کہ میرا گھر طواف کرنے والوں۔ معتکفوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لئے پاکیزہ کرکے (بنائیں)۔

کس قدر عجیب سماں تھا کہ ابراہیم جیسا باپ اور اسمٰعیل جیسا بیٹا (علیہما الصلوٰۃ والسلام)۔ دنیا کے بتکدے میں وہ پہلا گھر خدا کا + بنا رہے ہوں گے۔ بیٹا پتھر اور چونا لاتا تھا اور باپ دیواریں کھڑی کر رہا تھا۔ کام بھی کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ دعائیں بھی مانگتے جاتے۔ کہ

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم ۝ ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا امة مسلمة لك ۝ وارنا مناسكنا وتب علينا انك انت التواب الرحيم ۝ ربنا وابعث فيهم رسولا منهم يتلوا عليهم ايتك ويعلمهم الكتاب والحكمة ويزكيهم انك انت العزيز الحكيم ۝ ( )

الٰہی جو کچھ ہم تیرے لئے کر رہے ہیں اسے قبول فرما بیشک تو ہی (دعاؤں کا) سننے والا ہے اور (دلوں کے حال) جاننے والا ہے۔ الٰہی ہم کو اپنا مسلم بنا۔ اور پھر ہماری نسل میں سے ایک ایسی قوم پیدا کر جو ہماری ہی طرح مسلم ہو تو ہم کو اپنی اطاعت کے راستے دکھا دے۔ ہماری خطاؤں سے درگذر کر کہ تو ہی خطا بخش و رحیم ہے۔ اے خدا۔ اس امت میں سے (جس کے لئے دعا کی گئی ہے) ایک ایسا رسول بھیجیو جو ان کو تیری آیات پڑھکر سنائے۔ کتاب و حکمت کی انھیں تعلیم دے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرے۔ اے اللہ تو ہی صاحب اختیار اور حکمت والا ہے۔

دو اولیں مسلم خدا پرستوں کی دعا کے یہ الفاظ ادھر زبان سے نکل رہے تھے اور ادھر اجابت

بارگاہ ایزدی سے بہرا ستقبال آرہی تھی۔ وہ پتھر اور چونے کی عمارت جس کا سنگ بنیاد ان مقدس ہاتھوں نے رکھا تھا۔ کروروں انسانوں کی پرستش گاہ بنی۔ اور اللہ کا گھر کہلائی چشم فلک نے ہزاروں عمارتیں اٹھتیں اور پھر خاک میں ملتی دیکھیں۔ لیکن اس وحشت ناک صحرا میں دو غریب انسانوں کی بنائی ہوی عمارت اپنی اصلی بنیادوں کا پتہ آجتک دیتی چلی آرہی ہے۔ دنیا میں ہزاروں انقلاب آئے جنہوں نے زمین کے تختے الٹ رکھدیے لیکن اگر تمام حوادث ارضی و سماوی سے محفوظ رہی تو یہی مٹی اور پتھر کی چار دیواری بڑی بڑی متمدن قوموں کی تاریخی روایات لوگوں نے سنی اور بھلا دیں بڑے بڑے جابر و سرکش شاہنشاہوں کے کارہائے نمایاں صفحۂ تاریخ میں محفوظ ہوے اور حرف غلط کی طرح مٹ گئے لیکن ان دو مخلص برگذیدہ ہستیوں کی قربانی کی یاد پانچ ہزار سال سے آجتک قائم ہے۔ کیونکہ ان کے خدا کا ان سے وعدہ تھا کہ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ بیشک اس کی راہ میں کوئی قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔

یہ تھے اس بزرگ و مقدس ہستی کے بعض اعمال حیات جنھیں امت مسلمہ کے لئے لبطور اسوہ حسنہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ایک وجود اقدس کے اندر یقیناً ایک امت کا راز حیات مضمر تھا۔ اور جب تک وہ امت موجود ہے۔ وہ بھی موجود رہے گا۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا۔ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ ۝ بیشک ابراہیم ایک اطاعت گذار امت تھا۔ جو ایک اللہ کا ہو گیا تھا۔ اور وہ مشرکین میں سے نہ تھا۔

گوسالہ سامری

از

مولٰنا عبداللہ العمادی

ای برہمن آن عذار چوں لالہ پرست رخسار نگار چار دہ سالہ پرست
گر چشم خدا بین نداری بارے خورشید پرست شو نہ گوسالہ پرست

(۱)

ایک سامری وہ تھے جن کے آثار تمدن آج کل سندھ کے حفریات سے نمایاں ہو رہے ہیں اصطلاحی معنی میں یہ سامی قوم اگر عرب نہ تھی تو کوئی شک نہیں کہ عربی قومیت کے خاندان سے قریب ترین تعلق رکھتی تھی، حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے کئی ہزار برس قبل سامریوں نے عراق سے نکل کر ہندوستان کا رخ کیا اور سندھ میں ایک ایسے تمدن کی طرح ڈالی جس کے خط وخال کی نموداریوں نے آج ایک عالم کو محو حیرت بنا رکھا ہے۔ بلوچستان اور ملیبار میں اس قوم کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ اور اگرچہ اس قدیم تہذیب کا نشان معدوم ہو چکا ہے مگر نام اب بھی موجود ہے۔

لیکن آج کے مضمون سے یہ سامری متعلق نہیں۔

آج کا مضمون اس سامری سے متعلق ہے جس نے ایک گوسالہ بنایا تھا۔ اور بتعبیرے یہودیوں سے اس کی پوجا کرائی تھی عجب نہیں یہ بھی اسی قوم کا بقیہ ہو،

اس گوسالہ پر ایک عجیب افسانے کا رنگ چڑھایا گیا ہے اور اس رنگ سازی میں کلام اللہ کو لایا گیا ہے، ایسی رنگینی پیدا کرنے والے دماغوں سے گوسالہ آرائی پر بحث کی ضرورت نہیں۔

ضرورت صرف اس قدر ہے کہ گوسالہ آرائی کی ذہن میں آیات کلام اللہ کے متعلق جو خلط ملط کیا گیا ہے اس کو صاف کر دیا جائے۔

اس باب میں اہل نظر کے نقل اقوال پر ہی میں نے قناعت کی ہے خود میری کوئی رائے نہیں، اور خدا نہ کرے کہ میں کلام اللہ کے مفہوم تعین کرنے میں اپنی رائے کو دخل دوں۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا ہوں گو قدم راہبر کو میں ؎

سامری کے گوسالہ کا تذکرہ تو کئی جگہ ہے لیکن گوسالہ میں آواز پیدا ہونے کے سبب کا تذکرہ بیان کیا جاتا ہے کہ سورۂ طٰہٰ میں ہے آیات ذیل ملاحظہ ہو۔

وَمَا اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝
قَالَ هُمْ اُولَاۤءِ عَلٰۤى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ
رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا
قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ۝
فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ
اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ
رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ
الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ
غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ ۝
قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا
حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ

اور جب موسیٰ تورات لینے آگے بڑھ آئے تو ہم نے پوچھا کہ اے موسیٰ تم جلدی کرکے اپنی قوم سے کیسے آگے آگئے عرض کیا وہ بھی یہ میرے پیچھے (ہی پیچھے چلے آ رہے ہیں) اور اے میرے پروردگار میں جلدی کرکے تیری طرف اس لئے بڑھ آیا ہوں کہ تو (مجھ سے) خوش ہو فرمایا کہ ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو (ایک اور) بلا میں مبتلا کر دیا ہے اور (وہ یہ ہے کہ) ان کو سامری نے گمراہ کیا۔ پھر موسیٰ غصے اور افسوس کی حالت میں اپنی قوم کی طرف واپس آئے اور آکر لگے کہنے کہ بھائیو! کیا تم سے تمہارے پروردگار نے عمدہ (کتاب یعنی تورات کے دینے کا)

فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ٥
فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ
فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ٥
فَنَسِيَ ٥ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ
اِلَيْهِمْ قَوْلًا وَّلَا يَمْلِكُ ضَرًّا وَّ
لَا نَفْعًا ٥ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ
هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا
فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ
فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ٥
قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ
حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ٥ قَالَ
يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ
ضَلُّوْٓا ٥ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ
اَمْرِيْ ٥ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ
بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ
اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ٥ قَالَ فَمَا
خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ٥ قَالَ بَصُرْتُ
بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ

وعدہ نہیں کیا تھا تو کیا تم کو (اس وعدے کی) مدت
بڑی لانبی معلوم ہوئی اور اس وجہ سے تم نے اس عہد کے
خلاف کیا جو (خدائے واحد کی پرستش کا) مجھ سے کر چکے تھے
(وہ) لگے کہنے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تمہارے ساتھ
عہد شکنی نہیں کی (ہم کو یہ معاملہ پیش آیا کہ قبطیوں کی) قوم کے
زیوروں کا بوجھ جو (مصر سے چلتے وقت) ہم پر لاد دیا گیا تھا
اب (سامری کے کہنے سے) ہم نے اس کو (آگ میں) لا ڈالا
اور اسی طرح سامری نے بھی (اپنے پاس کا زیور) ڈالا (پھر سامری
ہی نے) لوگوں کے لئے (اس کا) ایک بچھڑا (بنا کر) نکال کھڑا کیا
(یعنی بچھڑے کا) بت جس کی آواز (بھی) بچھڑے کی سی تھی اس پر
(بعض لوگ) لگے کہنے کہ یہی تو تمہارا معبود ہے اور (موسیٰ کا معبود
بھی) یہی تھا اور وہ بھول کر کوہ طور پر چلا گیا ہے۔ کیا ان لوگوں کو
اتنی بات بھی نہیں سوجھ پڑتی تھی۔ کہ (بچھڑا) ان کی بات کا
نہ تو الٹ کر جواب دیتا ہے اور نہ ان کے کسی نقصان کا مالک
ہے اور نہ کسی نفع کا۔ اور ہارون نے (بچھڑے کی پرستش سے) پہلے
ان سے کہا بھی کہ بھائیو! یہ تو اس (بچھڑے) کے ذریعہ سے تمہاری
آزمائش کی جا رہی ہے۔ ورنہ تمہارا پروردگار تو خدائے رحمٰن ہے
تم میرے کہے پر چلو اور میری بات مانو۔ (وہ) لگے کہنے کہ جب تک
موسیٰ لوٹ کر ہمارے پاس (نہ) آئیں ہم (تو) برابر اسی (بچھڑے

قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا
وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ۔ قَالَ
فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ
اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ
مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ۔ وَانْظُرْ
اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ
عَاكِفًا۔ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ
فِي الْيَمِّ نَسْفًا۔ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ
اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔
وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا۔

(سورۃ ۲۰۔ رکوع ۳ و ۴۔ آیت ۶۴ ـــ ۷۷)

کی پرستش) پر جمے بیٹھے رہیں گے (موسیٰ نے ہارون کی طرف خطاب کرکے) کہا کہ ہارون! جب تم نے ان کو دیکھا تھا (کہ یہ لوگ) گمراہ ہوگئے تو تم کو کیا وجہ مانع ہوئی کہ تم نے میری (ہدایت کی) پیروی نہ کی۔ کیا تم نے میری عدول حکمی کی (وہ) بولے کہ اے میرے ماں جائے (بھائی) میری ڈاڑھی اور (سر) کے بال، تو پکڑو نہیں میں اس (بات) سے ڈرا کہ (تم واپس) آکر کہیں یہ (نہ) کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔ (اب موسیٰ نے سامری سے) پوچھا کہ سامری! تیرا کیا حال ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے وہ چیز دکھائی دی جو اوروں کو نہیں دکھائی دی (جبرئیل کو دیکھا کہ وہ گھوڑے پر سوار چلے جارہے ہیں) تو میں نے جبرئیل فرشتے کی گھوڑی کے نقش قدم (کی مٹی) سے ایک مٹھی بھرلی پھر اس کو ڈھلے ہوئے بچھڑے میں ڈال دیا (اور وہ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔) اور (اس وقت) میرے دل نے مجھکو ایسی ہی صلاح دی، موسیٰ نے کہا چل (دور ہو) اس زندگی میں تو تیری یہ سزا ہے کہ (زندگی بھر کہتا پڑا پھرے کہ) دیکھو مجھے کوئی) چھو نہ جانا (ورنہ ہم دونوں کو تپ آجائے گی) اور (اس کے علاوہ) تیرے لئے (عذاب قیامت کا) ایک وعدہ اور بھی ہے جو کسی طرح تجھ پر سے ٹلے گا نہیں اور اپنے اس معبود (یعنی بچھڑے) کی طرف دیکھ جس (کی پرستش) پر تو جا بیٹھا تھا۔ اس کو ہم جلا کر (راکھ کر) دینگے۔ پھر اس راکھ کو دریا میں بکھیر کر بہادیں گے۔ لوگو تمہارا (اصل) معبود بس اللہ ہے جس کے سوا کوئی (اور) معبود نہیں (اور) اس کا علم سب چیزوں پر حاوی ہے۔

حسب معمول ان آیات کا ترجمہ بھی شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم سے ماخوذ ہے
یہودیوں میں اس قصّے کے متعلق بہت سی دور از کار روایتیں مشہور تھیں جو مفسرین کی عنایت سے
مسلمانوں میں اب تک مشہور چلی آتی ہیں اور ہمارے شمس العلماء نے تو بطور ایک واقعہ مسلّمہ کے آیات
کا ترجمہ بھی اسی انداز میں کیا ہے اس ترجمہ کی بناء پر قرآن کریم کو متعدد حملے برداشت کرنا پڑتے ہیں

(الف) جبرئیل کی گھوڑی کے نقش قدم کی مٹی سامری کو کیونکر ملی ؟

(ب) کیا آسمانی فرشتے گھوڑوں پر سوار ہو کر زمین کی سیر کیا کرتے ہیں۔ ؟

(ج) کیا ان گھوڑوں کے نقش قدم کی مٹی کو ڈھلے ہوئے مجسمے کے جوف میں ڈالنے
سے اس کا زندہ جانور ہو جانا ممکن ہے ؟

(د) سامریین کا فرقہ تو حضرت موسیٰ کے زمانے سے تعلق نہیں رکھتا پھر یہ سامری اس زمانہ
میں کہاں سے نکل آیا ؟

(ہ) تورات تو کہتی ہے کہ حضرت ہارون نے بچھڑا بنایا تھا پھر اس واضح تصریح کے ساتھ
کلام اللہ کا کھلا ہوا اختلاف کیا معنے رکھتا ہے ۔ ؟

ہمارے دوست شیخ عبدالقادر مغربی نے جو طرابلس الشام کے محقق ہیں۔ ان شبہات کی
تاویل کی ہے، اگر ان کو چوتھے اور پانچویں شبہہ کے متعلق غور کرنے کا موقع نہیں ملا، پہلے دوسرے اور
تیسرے اعتراضات میں جبرئیل کی گھوڑی کا واقعہ اور اس کے نقش قدم کی مٹی کے ذریعہ سے ڈھلے
ہوئے بچھڑے میں جان کا آجانا یہ دونوں باتیں ان کی رائے میں قرآن سے مستنبط ہو رہی ہیں لیکن
اعتراضات کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ :۔

۱۔ قرآن نے سامری کے قول کو نقل کیا ہے ممکن ہے اسی نے جھوٹ کہا ہو لیکن اس سے
قرآن پر حرف نہیں آسکتا ۔

۲۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ بچھڑے کا مجسمہ زندہ ہوگیا تھا۔ وہ صرف آواز کا تذکرہ کر رہا ہے جو عجیب نہیں کہ کسی کل کے ذریعہ سے سامری نے پیدا کر لی ہو۔

سید احمد خان کی رائے میں "ایک لفظ بھی قرآن مجید کا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اس بچھڑے میں سچ مچ کی اور خدا کے پیدا کئے ہوئے بچھڑے کے مانند آواز تھی۔ بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سامری نے اس بچھڑے کو اس طرح بنایا تھا کہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی۔ ہزاروں جانور اب بھی کاریگر اس طرح سے بناتے ہیں کہ وہ اڑتے ہیں۔ ہلتے ہیں۔ حرکت کرتے ہیں بولتے ہیں۔ سامری نے بھی اس بچھڑے کو ایسی کاریگری سے بنایا تھا کہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی[۵]"

یہ مضمون قابل اعتنا ہے لیکن مرحوم نے اس کے ساتھ جبریل[۴] کی گھوڑی کے نقش قدم کی مٹی لے کر بچھڑے کے جوف میں ڈالنے کے واقعہ سے تو بڑی سختی سے انکار کیا ہے اگر وہ یہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ جب پہاڑ کو جا رہے تھے تو سامری نے ان کے نقش قدم کی مٹھی بھر مٹی اٹھالی تھی اور بعد کو وہی مٹی بچھڑے کے جوف میں ڈالی تھی[۱]۔

کلام اللہ کے الفاظ بہت ہی واضح اور صاف صاف ہیں۔ ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہ اس کا ترجمہ جبریل فرشتہ۔ یا فرشتہ کی گھوڑی۔ یا مٹی کر سکتے ہوں ابو مسلم کی رائے میں حضرت موسیٰ نے جب سامری کو ملامت کی تو اس نے انھیں مخاطب کر کے کہا کہ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (مجھے ایسی بات سوجھی جو کسی کو نہ سوجھی تھی اے رسول (موسیٰ) میں پہلے تمہاری پیروی کرتا تھا لیکن اب میں نے چھوڑ دی اور میرے جی میں ایسا ہی آیا)۔ عربی محاورہ میں پیروی کے لئے قبض اثر کا استعمال عام طور پر رائج ہے۔ اور شعرائے جاہلیت کے کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: هٰذا ما عندهم، اما الذی عندی فاسبح اللّٰہ کثیرا واذکرہ

کثیر الیطمئن قلبی الا بذکر اللہ تطمئن القلوب"۔

ابو مسلم اصفہانی لکھتے ہیں:۔

لیس فی القرآن تصریح بھذا الذی ذکرہ المفسرون[1] فھھنا وجہ آخر وھو ان یکون المراد بالرسول موسیٰ علیہ السلام وباثرہ سنتہ ورسمہ الذی امر بہ فقد یقول الرجل فلان یقفو اثر فلان ویقبض اثرہ اذا کان

مفسرین جو بیان کرتے ہیں قرآن میں اس کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے[1]، یہاں ایک دوسری بات ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ رسول سے حضرت موسیٰ مراد ہیں اور اثر الرسول سے ان کی سنت و طریقہ مراد ہے جس کی پابندی کا انہوں نے حکم دیا تھا جب کوئی کسی کے طریقے کا پابند ہوا کرتا ہے تو کہتے ہیں "فلان یقفو اثر فلان ویقبض اثرہ" یا فلان یقبض اثر فلان؛

---

[1] مفسرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کی تمام جماعت لے کر مصر سے شبا شب نکل آئے تو فرعون نے لشکر لے کر ان کا پیچھا کیا۔ جاتے جاتے بنی اسرائیل جب دریا کے کنارے پہنچے تو حضرت موسیٰ کے معجزہ سے وہ پایاب ہو گیا اور سب لوگ پار اتر گئے۔ فرعون یہ دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا لیکن خدا کو تو اس کا غرق کرنا منظور تھا حضرت جبرئیل ایک انسان کے بھیس میں گھوڑی پر سوار آ نکلے۔ فرعون کے گھوڑے کے آگے اپنی گھوڑی کر دی اور دریا میں اتر گئے فرعون کا گھوڑا یہ دیکھ کر شوخی کرنے لگا اور فرعون کو لیکر بے ساختہ گھوڑی کے پیچھے دریا میں اتر گیا۔ مصریوں نے جب اپنے بادشاہ کو دریا میں اترتے دیکھا تو سب لوگ اس کے پیچھے ہو لئے اور بیچ دھار میں جا کر سب کے سب ڈوب گئے۔ سامری کی پرورش حضرت جبرئیل نے کی تھی لہذا وہ انھیں خوب پہچانتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ حضرت جبرئیل گھوڑی پر سوار جا رہے ہیں تو گھوڑی کے نقش قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی اٹھالی اور جب حضرت موسیٰ تورات لینے کے لئے کوہ طور پر گئے تو سونے چاندی کے زیور جو مصر سے باہر نکلنے کے قبل بنی اسرائیل کی عورتیں قبطیوں سے مستعار لیکر بھاگ آئی تھیں سامری نے ان سب کو اکٹھا کیا اور تمام زیوروں کو گلا کر ایک بچھڑا بنایا اور اس کے جوف میں وہی مٹی جو حضرت جبرئیل کی گھوڑی کے نقش قدم سے اس نے اٹھائی تھی ڈالدی جس کی وجہ سے بچھڑا زندہ ہو گیا اور بولنے لگا۔ اس طرح کی بہت سی باتیں عرب کے یہودیوں میں مشہور تھیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ افسانے اس طرح سے قرآن کریم میں کہیں بھی مذکور نہیں ہیں۔

يمتثل رسمه والتقدير ان موسىٰ
عليه السلام لما اقبل على السامری
باللوم والمسألة عن الامر الذی
دعاه الى اضلال القوم فی باب
العجل فقال بصرت بما لم يبصروا
به- ای عرفت ان الذی انتم عليه
ليس بحق وقد كنت قبضت قبضة
من اثرك ايها الرسول ای شيئا
من سنتك ودينك فنبذتها ای
طرحتها فعند ذالك اعلمه موسىٰ
عليه السلام بما له من العذاب
فی الدنيا والاخرة انما اورد
بلفظ الاخبار عن غائب كما
يقول الرجل لرئيسه وهو مواجه
له ما يقول الامير فی كذا وباذا يأمر
الامير واما دعاؤه موسى عليه السلام
رسولا مع جحده وكفره فعلى مثل مذهب
من حكى الله تعالى عنه قوله يايها الذی
نزل عليه الذكر انك لمجنون وان لم

یعنی اس کی روش کی پیروی کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت
موسیٰ جب سامری کو ملامت کرنے لگے اور پوچھا کہ کیا بات تھی
کہ گوسالہ کے ذریعہ سے لوگوں کو گمراہ کر ڈالا تو اس نے جواب دیا
کہ مجھے وہ سوجھی جو تم میں سے کسی کو نہ سوجھی" یعنی مجھے معلوم ہو گیا
کہ جس طریقہ پر تم ہو وہ درست نہیں ہے "اے پیغمبر پہلے میں نے
تمہارے اثر کو کچھ قبضہ میں کر لیا تھا" یعنی تمہارے طریقہ و
مذہب کا کچھ پابند تھا "بعد کو میں نے اسے چھوڑ دیا" یہ سن کے
حضرت موسیٰ نے اس کو بتایا کہ اس کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے
اور دنیا و آخرت میں اس کو کیا کیا عذاب ہوں گے
سامری نے رسول کہکر حضرت موسیٰ سے اس طرح باتیں کی
تھیں جیسے کسی غائب کا تذکرہ ہو رہا ہو۔ اس کی مثال
ایسی ہی ہے جیسے کسی بڑے آدمی سے کوئی اس کے روبرو
کہے کہ "اس امر میں امیر کا کیا حکم ہے" یا فلاں مسئلہ میں
بادشاہ سلامت کیا فرماتے ہیں" رہی یہ بات کہ سامری
تو منکر تھا پھر اس نے حضرت موسیٰ کو رسول کیوں کہا۔
تو اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر
کی نسبت کافروں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اے وہ شخص
کہ اس پر وحی اتری ہے تو مجنون ہے" حالانکہ ان کافروں
میں کوئی بھی پیغمبر پر وحی اترنے کا۔

يؤمنوا بالانزال ۔ ؎

قائل نہ تھا ۔ ؎

امام رازی نے اس مضمون کو حرف بحرف نقل کیا ہے ۔ اور پھر فرماتے ہیں:۔

واعلم ان هٰذا القول الذي ذكره ابو مسلم ليس فيه الا مخالفة المفسرين ولكنه اقرب الى التحقيق لوجوه احدها ان جبرئيل عليه السلام ليس بمشهور باسم الرسول ولم يجر له فيما تقدم ذكر حتى يجعل اللام التعريف اشارة اليه فاطلاق لفظ الرسول لارادة جبرئيل عليه السلام كانه تكليف بعلم الغيب۔ وثانيها انه لابد فيه من الاضمار وهو قبضة من اثر حافر فرس الرسول والاضمار خلاف الاصل۔ وثالثها انه لابد من التعسف في بيان ان السامري كيف اختص من بين جميع الناس برؤية جبرئيل عليه السلام ومعرفته؟ ثم كيف عرف ان لتراب حافر فرسه هٰذا

واضح ہو کہ یہ قول جو ابو مسلم نے بیان کیا ہے اس میں مفسرین کے اقوال کی مخالفت تو ہے لیکن یہ قول تحقیق کے بہت قریب ہے ۔ اس کی کئی وجہیں ہیں ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت جبرئیل رسول کے نام سے مشہور نہ تھے اور نہ پہلے کہیں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ الف ولام تعریف ان کے نام (رسول) پر آتا اور اس سے جبرئیل مراد ہوتے ۔ رسول کہنا اور جبرئیل مراد لینا یہ تو گویا علم غیب کی تکلیف دینا ہے ۔

دوسرے یہ ہے کہ اس صورت میں ضمیر لانے کی ضرورت ہو گی ۔ یعنی رسول کے گھوڑے کے سم کا نقش ۔ اور ظاہر ہے کہ ضمیر خلاف اصل ہے؛

تیسری مشکل یہ ہے کہ اس توجیہ میں ضرور تکلف کرنا پڑے گا ۔ کہ تمام لوگوں میں اکیلے ایک سامری ہی نے مخصوص طور پر کیسے جبرئیل کو دیکھا اور انھیں پہچان بھی لیا ۔ پھر اسے کیونکر معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل کی گھوڑی کے سم کی مٹی میں یہ اثر ہے ۔ مفسرین یہ جو توجیہ کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل ہی نے سامری کو پالا تھا ۔ تو یہ اور

؎ تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۶۸ و ۶۹ طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ

الاثر؟ والذی ذکروہ من ان جبرئیل علیه السلام هو الذی رباه فبعید لان السامری ان عرف جبریل حال کمال عقله عرف قطعًا ان موسی علیه السلام نبیٌّ صادقٌ فکیف یحاول الاضلال ـ وان کان ما عرفه حال البلوغ فأیّ منفعة لکون جبرئیل علیه السلام مربیًا له حال الطفولیة فی حصول تلک المعرفة۔

بھی دور کی بات ہے اس لئے کہ سامری کو جب پوری عقل آچکی تھی اس زمانے میں اگر جبرئیل کو پہچانتے ہوتا تو یقیناً اس کو یہ بھی معلوم ہوا ہوتا کہ حضرت موسی علیہ السلام سچے پیغمبر ہیں۔ اس صورت میں وہ گمراہ کرنے کا کیوں کر قصد کرسکتا تھا اور اگر اس نے بلوغ کے زمانے میں حضرت جبرئیل کو نہیں پہچانتا تھا تو اگر جبرئیل لڑکپن میں اس کے مربی رہے بھی تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ اور یہ سابقہ معرفت کس طرح کام آسکتی تھی۔

و/ رابعها انه لو جاز اطلاع بعض الکفرة علی تراب هذا شانه فلقائل ان یقول۔ فلعل موسی علیه السلام اطلع علی شیٔ اخر یشبه ذلك فلاجله اتی بالمعجزات ویرجع حاصله الی سوال من یطعن فی المعجزات ویقول لم لا یجوز ان یقال انهم لاختصاصهم بعض الادویة التی لها خاصیة

چوتھی وقت یہ ہے کہ اگر یہ جائز ہے کہ ایسی تاثیر کی مٹی سے کفار واقف ہوسکتے ہیں۔ تو اعتراض کرنے والے کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ عجب نہیں حضرت موسیٰ نے بھی اسی تاثیر کی کوئی اور چیز پائی ہو اور اسی کے اثر سے یہ معجزات صادر ہوئے ہوں نتیجہ یہ ہوگا کہ معجزات میں طعن کرنے کی ایک اور سبیل نکل آئے گی اور معترض کہیگا کہ یہ کہنا کیونکر ناجائز ہوسکتا ہے کہ پیغمبروں کو بعض ایسی دوائیں مل گئی ہوں جنکی خاصیت سے اس طرح کے معجزات صادر ہوسکتے ہوں۔ غرض کہ یہ وجہ صورتاً ہے

ان تفید حصول تلک المعجزة اتوا تلک المعجزة" وحینئذٍ ینسد باب المعجزات بالکلیہ

کہ اس افسانہ کو اگر صحیح مانا جائے، تو معجزات کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔

اما قوله" وکذلک سولت لی نفسی" فالمعنی فعلت ما دعتنی الیه نفسی۔ وسولت ماخوذ من السوال فالمعنی لم یدعنی الی ما فعلته احد غیری بل اتبعت هوای فیه ؎

سامری کا یہ کہنا کہ وکذلک سولت لی نفسی ایسا ہی میرے جی میں آیا، اس کا یہ مطلب ہے کہ میرے نفس نے جو تحریک کی اسی پر میں کاربند ہوا۔ لفظ سولت، سوال سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے کسی دوسرے شخص نے مجھے اس جانب تحریک نہیں کی تھی بلکہ اس باب میں محض اپنی خواہش نفسانی کی میں نے پیروی کی ہے

(باقی)

؎ تفسیر جلد ۶ صفحہ ۶۹

حکومتِ الٰہی کا قیام

اسلام کے نام لیواؤ! خدا کی رحمت تمہاری نصرت کیلئے منتظر ہے، انبیاء و مرسلین کی پاک روحیں تمہاری کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں، فرشتے اپنے نورانی پر دل کھ پھیلائے ہوئے ہیں، اور دنیا تمہارے قرآنی اخلاق کا نمونہ ڈھونڈ رہی ہے۔

تو کیا

اے اسلام کے نام لیواؤ! تم ان کی امیدوں کو پورا نہ کرو گے اٹھو اور آمادہ ہو جاؤ کہ تم کو زمین پر آسمانی حکومت قائم کرانی ہے اور قرآنی قوانین کے نفاذ سے اس مادیت کے زمانے کو روحانیت کے زمانے میں تبدیل کر دینا ہے!!!

"مصلح"

مذاکرۂ علمیہ

مسئلہ جبر و قدر

(۲)

فلسفہ کی ناکامی لیکن اس بحث میں قدریت کی بہ نسبت جبریت کا پلڑا جھک جانے کے یہ معنی نہیں کہ فلسفہ نے اس گتھی کو سلجھا لیا، اور مسئلہ جبر کے حق میں طے ہو گیا، بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جب زیادہ گہری نگاہ سے ملکوت ارض و سموات کو دیکھتا ہے، اور اس مطالعہ کی مدد سے اس زبردست نظام کے چلانے والے کی صفات کا تصور کرتا ہے تو اکثر و بیشتر اس کے دل و دماغ پر ایسی دہشت طاری ہو جاتی ہے کہ اس کی نگاہ میں خود اپنی ہستی کی کوئی منزلت باقی نہیں رہتی اور اس کی مدہوش عقل اس سے کہتی ہے کہ جس کی قدرت اس لامحدود کائنات کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے جس کا ارادہ اتنی عظیم الشان سلطنت پر فرمانروائی کر رہا ہے جس کا علم اس نظام وجود کے چھوٹے اور بڑے سب کل پرزوں اور ان کی حرکات و سکنات پر ازل سے لیکر ابد تک حاوی ہے اس کے سامنے تو بالکل عاجز ہے، بے بس ہے، درماندہ ہے، تیری قدرت، تیرا علم، تیرا ارادہ کوئی چیز نہیں۔

اس سے بڑھ کر اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ فلسفہ نے قضا و قدر کے مسئلہ کو سمجھ لیا ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ قضا و قدر کا سوال حقیقت میں یہ سوال ہے کہ خداوند عالم کی سلطنت کا دستور اساسی کیا ہے؟ خدا کے علم اور اس کی معلومات، خدا کی قدرت اور اس کی مقدورات، خدا کے

ارادہ اور اس کی مرادات کے درمیان کس قسم کا علاقہ ہے؟ خدا کا حکم کیا معنی رکھتا ہے؟ کس طرح وہ اس کی مخلوقات میں نافذ ہوتا ہے؟ مخلوقات کے مختلف مراتب میں اس کے احکام کی تنفیذ کن ضوابط کے تحت ہوتی ہے؟ اور موجودات عالم کی بے شمار انواع میں سے ہر نوع کس حیثیت سے اس کی تابع فرمان ہے؟ اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے ان سوالات کو حل کر لیا ہے، تو دوسرے الفاظ میں اس کا دعوی یہ ہے کہ اس کے علم نے خدا کے علم اور اس کی معلومات کا احاطہ کر لیا ہے۔ یہ ان تمام باتوں سے زیادہ شنیع بات ہے جن کا الزام قدریہ اور جبریہ ایک دوسرے پر عائد کرتے ہیں۔ اور اگر ان کا دعویٰ یہ نہیں ہے، تو محض قیاس و استدلال کے بل بوتے پر، وہ علم و یقین کے ایسے مرتبہ تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں، جہاں قطعیت کے ساتھ جبر یا قدر کا حکم لگانا ان کے لئے ممکن ہو۔

طبیعی نقطۂ نظر طبیعیات میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے آتا ہے کہ تمام کائنات کی طرح انسان کے افعال بھی سلسلۂ اسباب کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس سے جو کچھ بھی صادر ہوتا ہے، کسی سبب یا متعدد اسباب کے اثر سے ہوتا ہے۔ ایک فعل کے وجود میں آنے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے اگر وہ جمع نہ ہوں تو فعل کا وجود میں آنا ممتنع ہے اور اگر جمع ہو جائیں تو اس کا وجود میں آنا واجب ہے۔ ان دونوں صورتوں میں انسان مجبور محض ہے اس لحاظ سے طبیعیات کا میلان ہمیشہ سے جبر ہی کی طرف رہا ہے۔ چنانچہ مادئین کا ابوالاباء دیمقراطیس (Democritus) جسے قدماء طبیعیین میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے صاف کہہ چکا ہے کہ عالم کی تمام اشیا قانون فطرت میں جکڑی ہوئی ہیں۔

تاہم جب تک طبیعیین نے نفس اور مادہ کے جوہری اختلاف سے انکار نہیں کیا تھا، اور جب تک وہ قوائے نفسیہ کو عالم مادہ سے کسی نہ کسی حد تک ماوراء سمجھتے تھے اس وقت تک قدریت کے لئے طبیعیات

میں کچھ نہ کچھ گنجائش نکل سکتی تھی لیکن جب اٹھارویں صدی کے آغاز سے علوم طبیعیہ نے غیر معمولی ترقی کی، اور سائنس کی دنیا میں تحقیق و اکتشاف کے نئے نئے دروازے کھلنے لگے تو نفس اور روح اپنی تمام قوتوں سمیت ترکیب مادّی اور مادّہ کے کیمیاوی امتزاجات کا نتیجہ قرار دے دیئے گئے اور انسان ایک نفسانی اور روحانی وجود کے بجائے محض ایک میکانکی وجود رہ گیا اس طرح طبیعیات کے حدود سے قدریت بیک بینی و دوگوش خارج کر دی گئی اور سائنس نے اپنا پورا وزن جبر کے پلڑے میں رکھ دیا۔

علم الحیات (Biology) اور علم وظائف الاعضاء (Physiology) کی جدید تحقیقات جن کی بدولت علم النفس اب قریب قریب انہی دونوں علوم کی شاخ بن گیا ہے یہ حکم لگا رہی ہیں کہ دماغ کی شکل اور اس کی ساخت، اور جرم دماغی و نظام عصبی کی کیفیت ہی پر انسان کی فطرت اصلیہ کا مدار ہے۔ اسی کی خرابی سے انسان کی فطرت خراب ہوتی ہے، اور اس سے بُرے رجحانات اور بُرے اعمال کا ظہور ہوتا ہے۔ اور اسی کی بہتری سے اس کی فطرت اچھی ہوتی ہے۔ اور وہ اچھے میلانات اور نیک اعمال کا مظہر و مصدر بنتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جرم دماغی اور نظام عصبی کی ساخت میں انسان کے آزاد ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے اس مادی نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ ماننا لازم ہو جاتا ہے کہ انسان کے اندر سرے سے آزادی کا کوئی عنصر ہی نہیں ہے جس طرح ایک لوہے کی مشین ایک لگے بندھے اصول پر کام کرتی ہے، اسی طرح انسان بھی طبیعت کے ایک زبردست قانون کے تحت کام کر رہا ہے۔ اخلاق کی زبان میں جس چیز کو ہم نیکی اور حسن سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سائنس کی زبان میں وہ عناصر جسمانی کی ترکیب صحیح اور نظام عصبی کی درست حالت ہے۔ اخلاق جسے بدی اور بد چلنی سے تعبیر کرتا ہے، سائنس اس کو جرم دماغی و نظام عصبی کا سقم قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے نیکی اور صحت، اور بدی اور بیماری میں کوئی فرق نہیں رہتا جس طرح ایک شخص اپنی اچھی صحت کے لئے مدح اور بیماری کے لئے ذم کا مستحق نہیں ہے، اسی طرح بدچلنی یا نیک چلنی کے لئے بھی وہ مدح یا ذم کا مستحق ہونا چاہیے۔

اس کے ساتھ ایک دوسرا زبردست قانون جو جبریت کی تائید کرتا ہے، قانون توریث (Law of heridity) ہے جس کے ارکان کو ڈارون اور رسل ولیس اور ان کے متبعین نے استوار کیا ہے۔ اس کی رو سے ہر شخص کی فطرت و سیرت اسی سانچے میں ڈھلتی ہے جو زمانہ ہائے ماسبق سے نسلاً بعد نسلٍ بنتا چلا آ رہا ہے، اور یہ موروثی سانچہ جس شکل میں فطرت و سیرت کو ڈھالتا ہے اس کو بدل دینے پر کوئی شخص قادر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے آج ایک شخص سے جو برائی ظاہر ہوتی ہے وہ گویا ایک پھل ہے اس بُرے بیج کا جو اب سے سو برس پہلے اس کے پردادا نے بویا تھا اور اس پردادا میں جو برائی تھی وہ بھی اس کو اپنی گذشتہ نسلوں سے ملی تھی۔ اس پھل کے ظہور و عدم ظہور میں اس شخص کے ارادہ و اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں ہے بلکہ وہ اسی طرح اس کے اظہار پر مجبور ہے جس طرح ایک آم کا درخت جو ایک کھٹے آم کی گٹھلی سے اوگا ہے، کھٹا آم پیدا کرنے پر مجبور ہے۔

تاریخ کا نظریہ بھی جبر ہی کا مؤید ہے۔ اس کی رو سے اسباب خارجی کی تاثیرات مجموعی حیثیت سے اس پوری انسانی جماعت کی فطرت و سیرت کو متأثر کرتی ہیں جو ان اسباب کے تحت رہتی ہو اور اسی بناء پر اس جماعت کے خصائص ان سے مختلف اسباب کے زیر اثر رہنے والی قوم کے خصائص سے مختلف ہوتے ہیں اگر ہم عمیق نگاہ سے دیکھیں تو اس اختلاف فطرت و سیرت کا مرجع ان اسباب خارجی کے اختلاف کو قرار دے سکتے ہیں جن کے تحت دو مختلف قوموں نے نشو و نما پایا ہے۔ اس طرح اگر ہم ان اسباب خارجی کی روشنی میں کسی قوم کے خصائص کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ہم پوری صحت کے ساتھ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ وہ کن حالات میں کیا روش اختیار کرے گی۔ فرد کے شخصی ارادہ و اختیار کے لئے اس ہمہ گیر قانون کی مقرر کی ہوئی راہ سے انحراف کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔ اگر افراد کی شخصی آزادی تسلیم کر لی جائے تو اس زبردست تشابہ کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی جو صدیوں تک ایک قوم کے اعمال و افعال میں دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کسی طرح متصور نہیں ہے کہ قوم کے تمام افراد متفق ہو کر بالارادہ ایک ہی سے

اعمال کرتے چلے جائیں۔

اعداد و شمار کے فن نے بھی تجربی بنیاد پر جبر کی حمایت کی ہے بڑی بڑی آبادیوں کے متعلق مختلف حالات میں جو اعداد و شمار فراہم کئے گئے ہیں۔ انھیں جب ان خارجی اسباب کی روشنی میں دیکھا گیا جن کے تحت وہ حالات پیش آئے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ ہر جماعت میں مخصوص اسباب کے اثر سے مخصوص حالات پیش آتے ہیں، اور ان حالات میں کثیر افراد کے اعمال بالکل ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں اس قسم کے تجربات سے یہ علم اب اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ ایک ماہر فن ایک بڑی آبادی کے متعلق قریب قریب پوری صحت کے ساتھ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ وہ فلاں قسم کے حالات میں فلاں عمل کرے گی۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر شہر لندن میں کتنی خودکشیاں ہوں گی۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر شہر شکاگو میں کتنی چوریاں ہوں گی۔ اگر ایک ملک میں دوسرے ملک کی بہ نسبت قتل کے اعداد و شمار کا تناسب زیادہ ہو تو وہ قریب قریب صحت کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس کے معاشی یا عمرانی یا طبیعی اسباب یہ یہ ہیں۔ ایک ملک یا ایک بڑی آبادی میں جس طرح اموات پیدائش، جرائم، اور دوسرے واقعات کا اوسط سالہا سال تک یکسانی کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور جس طرح اجتماعی حالات کے تغیر و تبدل سے ان اعداد و شمار میں اتار چڑھاؤ ہوا کرتا ہے۔ اس کی توجیہ بجز اس کے اور کسی چیز سے نہیں کی جا سکتی کہ اسباب خارجی کی تاثیرات بڑی بڑی آبادیوں پر اس ہمہ گیری اور اس قوت کے ساتھ عمل کرتی ہیں کہ افراد کے شخصی ارادے ان کے خلاف چل نہیں سکتے۔

سائنس کی ناکامی

اس مختصر بیان سے واضح ہو گیا کہ وہی سائنس جس پر انسان نے اپنے تفوق اور اپنے افتخار کی بنیاد رکھی ہے۔ کس طرح اس کی تمام فکری بلند پروازیوں اور تحقیق و اکتشاف کی عقدہ کشائیوں کا سرمایۂ فخر و ناز اس سے چھین لیتا ہے اور کس طرح انسان خود اپنے علم، اپنی فکر اور اپنی تحقیق کی بنا پر اپنے آپ کو نباتات و جمادات اور بے جان مشینوں کی طرح ایک مضطر و بے اختیار ہستی تسلیم

کرلیتا ہے مگر اس تسلیم واعتراف کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ سائنس نے قضا و قدر کے مسئلہ کو بھی حل کرلیا ہے برعکس اس کے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائنس اس اختیار، قدرت، اور آزادی ارادہ کی کوئی توجیہ نہیں کرسکتا جس کو وجدانی طور پر ہم اپنے میں محسوس کرتے ہیں۔ جس کے آثار شب و روز ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں، اور جس کی بنا پر ہم ارادی اور اضطراری اعمال میں فرق کرتے ہیں یہی نہیں بلکہ خود نفس جس کے وجود پر انسان کا مختار اور صاحب ارادہ ہونا موقوف ہے سائنس کی تحقیقات سے بالاتر ثابت ہوا ہے، اور کوئی سائنٹیفک طریق تفتیش ابھی تک اس شے کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکا ہے، جو انسان کے مادی وجود میں ایسے آثار و افعال، اور صفات و خواص کا مبدأ و منتہی ہے، جن کو کسی مادی ترکیب اور کسی کیمیاوی امتزاج کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال اگر عالم طبیعی یہ کہے کہ انسان کی سیرت میں اس کے نظام عصبی اور جرم دماغی کی ساخت کو بہت کچھ دخل حاصل ہے تو اس کو تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ جسمانی خصائص، نفسانی خصائص کی واحد علت ہیں۔ اسی طرح اگر ناموس نشو و ارتقا کا محقق یہ کہے کہ انسان اپنی بہت سی خصوصیات وراثۃً حاصل کرتا ہے، تو اس کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر وہ یہ کہے کہ انسان میں سب کچھ موروثی ہے۔ اور اس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں تو دوسرے حقائق کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہم اس دعوی کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتے۔ اسی طرح تاریخ اور اعداد و شمار کی بنا پر جو نظریہ قائم کیا گیا ہے اس کی صحت بھی بس اسی حد تک ہے کہ شخص انسانی کو ایک بڑی حد تک ان خارجی تاثیرات نے مجبور کر رکھا ہے جو وسیع پیمانے پر قوموں اور جماعتوں کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہے کہ اجتماعی احوال کی گردش میں افراد کے شخصی ارادوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل ہی نہیں ہے۔ اور اجتماعی زندگی کی مشین میں اشخاص محض بے جان کل پرزوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں۔

پس علوم طبیعیہ اور ان کے توابع درحقیقت مسئلہ جبر و قدر کا تصفیہ نہیں کرتے۔ بلکہ ہم کو شاہدات

وتجربات کی بنا پر صرف یہ بتاتے ہیں کہ ہماری زندگی میں جبر کے حدود کہاں تک وسیع ہیں۔

اخلاقی نقطۂ نظر | خالص اخلاقیات کے دائرہ میں انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا سوال اس حیثیت سے نہیں آتا کہ ظاہری حالات کی تہ میں باطنی حقیقت کیا ہے۔ بلکہ یہاں اس پر اس نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے کہ انسان کی سیرت اور اس کے کردار پر حسن و قبح کا حکم اور اس کے اچھے اور بُرے رویہ پر مدح و ذم کا استحقاق، اور اس کے نیک و بد اعمال پر جزا و سزا کا استیجاب کس بنیاد پر ہے؟ اول نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قدریت کا پلّہ بھاری ہے، اور جبریت کی شکست یقینی۔ کیونکہ اگر انسان کو مجبور محض تسلیم کر لیا جائے، اور یہ مان لیا جائے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار سے نہیں کرتا، تو سرے سے اس کی ذمہ داری کا تصور ہی باطل ہو جاتا ہے۔ نیکی اور بدی بے معنی ہو جاتی ہے۔ اچھے اور بُرے کا کوئی مفہوم نہیں رہتا۔ نہ کوئی بڑے سے بڑا نیکوکار تعریف کا مستحق رہتا ہے۔ اور نہ بدتر سے بدتر گنہگار مذمت کا۔ نہ کوئی اچھے سے اچھا خادمِ خلق انعام کا مستوجب رہتا ہے، اور نہ سخت سے سخت مجرم سزا کا۔ ہماری عدالتیں، ہمارے قوانین، ہماری پولیس، ہمارے جیل خانے، ہمارے مدرسے، ہماری اخلاقی تربیت گاہیں، ہمارے وعظ، ہماری تقریریں، ہماری تحریریں، غرض وہ تمام چیزیں جو انسان کو صاحب ارادہ اور صاحب اختیار فرض کر کے، اصلاح، تعزیر، عبرت، اور موعظت کے لئے قائم کی گئی ہیں قطعاً بے کار اور لاحاصل قرار پاتی ہیں۔

لیکن بحث و تحقیق کے میدان میں دو چار قدم آگے بڑھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جبر اور قدریت کے اختلاف کا فیصلہ صرف اتنی سی بات پر نہیں ہو جاتا۔ اخلاقیات میں عمل کی قدر و قیمت سیرت اور محرکات عمل کی بنیاد پر جانچی جاتی ہے۔ اور سیرت و محرکات کا سوال آتے ہی یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ان عناصر کی تحقیق کی جائے جن سے انسان کی سیرت بنتی ہے اور ان اندرونی عوامل کا پتہ چلایا جائے۔ جو کردار اور عمل کی صورت میں ظہور کرتے ہیں۔ یہاں پہنچکر بحث کا رخ پھر طبیعیات، نفسیات

اور مابعد الطبیعیات کے مسائل کی طرف پھر جاتا ہے۔

قائلین جبر کہتے ہیں کہ انسان کی سیرت دو زبردست عنصروں سے بنی ہے، ایک فطرت اصلیہ جس کو لیکر وہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے خارجی تاثیرات جن سے وہ ہر لحظہ متاثر ہوتا ہے، اور جن کے سانچے میں وہ ڈھلتا رہتا ہے۔ پہلی چیز تو قطعاً وہبی ہے، جس میں انسان کے اختیار کو کچھ دخل نہیں ہے۔ ایک شخص ماں کے پیٹ سے جو فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ وہی اس کی سیرت کا مایۂ خمیر ہوتی ہے بری فطرت سے اچھے اعمال کا ظہور ممکن نہیں ہے۔ اور اچھی فطرت سے برے اعمال کا ظہور بھی غیر ممکن ہے۔ رہیں خارجی تاثیرات (جن میں طبیعی اور اجتماعی دونوں قسم کی تاثیریں شامل ہیں) تو وہ فطرت کے اس اصلی مادے کو پرورش کرتی ہیں اور اس کے قبول و استعداد کے مطابق اس کو ایک خاص شکل میں متشکل کر دیتی ہیں۔ ایک اچھی فطرت کا انسان اچھے ماحول میں ولی بن جاتا ہے، اور بری فطرت کا انسان برے ماحول میں شیطان۔ اسی طرح برا ماحول اچھی فطرت کی خوبیوں کو کم کر دیتا ہے، اور اچھا ماحول بری فطرت کی خرابیوں کو گھٹا دیتا ہے۔ فطرت اور ماحول کا تعلق بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیج کا تعلق، زمین، پانی، آب و ہوا، اور طریق باغبانی سے ہے۔ درخت کا اصل مادہ بیج ہے اور ان خارجی چیزوں پر اس کے اچھی طرح یا بری طرح بار آور ہونیکا انحصار ہے یہی حال انسان کا ہے۔ وہ ان دونوں قوتوں کے ہاتھوں مجبور ہے۔ نہ وہ اپنی فطرت کو بدل سکتا ہے۔ نہ اپنے انتخاب سے خارجی ماحول کو اختیار کرتا ہے، اور نہ ماحول کی تاثیرات سے متاثر ہونا یا نہ ہونا اس کے اختیار میں ہے۔

قدریہ میں سے انتہا پسند گروہ تو اس کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک فطرت اصلیہ اور ماحول کی تاثیرات کو اگر انسان کے کردار میں کوئی دخل ہے تو وہ صرف اضطراری اعمال کی حد تک ہے، رہے وہ اعمال جن کو انسان سوچ سمجھکر، اپنی قوت تمیز اور قوت فیصلہ سے کام لے کر بالارادہ کرتا ہے، تو ان میں ان دونوں کو کسی قسم کا دخل حاصل نہیں ہے، بلکہ وہ قطعاً اس کے اپنے اختیار کا نتیجہ ہیں، یہ خالص

قدریت ہے جس کو بعض لوگوں نے پیش کیا ہے۔ مگر اس نظریہ کو قبول کرنا بہت مشکل ہے، کیونکہ شعور عقل فہم، قوت تمیز اور قوت فیصلہ جن پر اس قدریت کی بنیاد ہے، خود وھبی ہیں۔ نہ انسان نے اپنے کسب سے ان کو حاصل کیا ہے اور نہ وہ ان میں بال برابر کمی و بیشی کرنے پر قادر ہے پھر ان قوتوں کے اثر سے وہ اپنے لئے عمل کی جو راہ بھی اختیار کریگا، اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے آزادانہ اختیار کا نتیجہ ہے؟

متوسطین قدریہ کا مذہب یہ ہے کہ بلاشبہ انسان کی سیرت میں فطرت اصلیہ اور خارجی تاثیرات کو بہت کچھ دخل حاصل ہے انسان اچھے اور برے میلانات اور نیکی و بدی کی استعدادات لے کر پیدا ہوتا ہے اور طبیعی اور اجتماعی ماحول کے سانچے میں ڈھل کر اس کی سیرت ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے جو اس کے کردار میں دخل رکھتی ہے، اور وہ انسان کا غیر مقدر اختیار ہے۔ ہم انسان کی نیکی اور بدی کے متعلق جو احکام لگاتے ہیں وہ اس کی پیدائشی فطرت یا اس کے طبیعی و اجتماعی ماحول کی بنا پر نہیں ہوتے، بلکہ اسی غیر مقدر اختیار کی بنا پر ہوتے ہیں جہاں تک پہلی دونوں چیزوں کا تعلق ہے، ان کے لحاظ سے انسان مجبور ہے اور اس کے کردار کا جو حصہ ان کے زیر اثر ہے۔ وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بالکل بے قیمت ہے البتہ اخلاقی قدر و قیمت اور نیک و بد کے احکام جس چیز پر مترتب ہوتے ہیں وہ صرف تیسری چیز ہے، یعنی انسان کا غیر مقدر اختیار۔

باقی۔

نقد و نظر

دی قرآنک ورلڈ مجلس تحریک قرآن نے یہ سہ ماہی رسالہ انگریزی زبان میں جاری کیا ہے جس کا مقصد وہی ہے جو ترجمان القرآن کا ہے یعنی قرآن مجید کی تعلیمات کو پھیلانا، اور لوگوں کو اس کتاب الٰہی سے نور ہدایت حاصل کرنے کی طرف رغبت دلانا۔ نمونہ کے پہلے پرچہ میں جرمن نومسلم بیرن عمر رالف ایہرن فلس، انگریز نومسلم ڈاکٹر خالد شیلڈریک، محمود پال ڈیر (ٹائمز آف انڈیا کے نیوز ایڈیٹر) اور محمد مارماڈیوک پکتھال صاحب کے مضامین اور ہمارے محترم بزرگ نواب سر نظامت جنگ بہادر نے "قرآن بحیثیت رہنمائے حیات" کے عنوان پر ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے جو ان کی عمیق فکر و بصیرت کا نتیجہ ہے۔ امید ہے کہ انگریزی دان حضرات بکثرت اس رسالہ کے افادات سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

قیمت سالانہ ایک روپیہ۔ دفتر مجلس تحریک قرآن حیدرآباد سے طلب فرمائیے۔

اصلاح یہ ماہوار رسالہ تبلیغ دین اور اصلاح عقائد مسلمین کیلئے حال میں لکھنؤ سے جاری کیا گیا ہے۔ جس کے ایڈیٹر مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی نگرامی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کی نگرانی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ رسالہ اسلام اور مسلمانوں کی بہترین خدمت انجام دیگا۔ اب تک جتنے نمبر شائع ہوئے ہیں ان میں اعلیٰ درجہ کے اصلاحی اور تبلیغی مضامین درج کئے گئے ہیں۔ اور ایک مستقل باب "قبول اسلام" کا رکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمیافتہ اور سلیم القلب لوگوں کو کس طرح اسلام اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ قیمت سالانہ تین روپیہ۔ دفتر رسالہ اصلاح۔ بادشاہ باغ لکھنؤ۔

گلدستۂ احادیث نبوی مولوی احمد علی صاحب ناظم انجمن خدام الدین لاہور نے بخاری شریف و مسلم شریف سے انتخاب کرکے سو احادیث کو اس چھوٹے سے رسالہ میں جمع کر دی ہیں جتنی حدیثیں انتخاب کیگئی ہیں وہ سب مسلمانوں کو عبادات اور معاملات کے مختلف شعبوں میں بہترین ہدایت دینے والی ہیں۔ ہر حدیث کے نیچے اس کا ترجمہ دیا گیا ہے اور تھوڑی سی تشریح کردی ہے۔ جو لوگ اس عہد پر دستخط کریں کہ وہ ان احادیث کو یاد اور ان پر عمل کریں گے، ان کو یہ رسالہ ایک آنہ کے ٹکٹ بھیجنے پر مفت مل سکتا ہے۔

نرخنامہ و قواعد اشتہارات

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	۱۰ عہ	۲۵ عہ	للعہ	۸۰ عہ
نصف صفحہ	۶ ے	لعہ	لعہ	للعہ
ربع صفحہ	للہ	۱۰ عہ	معہ	لعہ

۱۔ کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شائع نہ کیا جائیگا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کئے جائیں گے جو اس رسالہ کی وضع و ہیئت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

۴۔ نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامہ کی بہ نسبت ۲۵ فیصدی زیادہ ہوگی۔

قواعد

رسالۂ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۵ تاریخ کو شایع ہوا کرے گا۔ یعنی ۲۰ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینہ کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی ان کو پرچہ قیمتہ دیا جائے گا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب رعایت کا مطالبہ نہ فرمائیں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر مضمون شائع کرے۔

مینیجر ترجمان القرآن

خیرت آباد۔ (حیدرآباد دکن)